دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۳ ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۰۹ء عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ہندوستان میں مسلمانوں نے جو حکومت قائم کی تھی وہ اگرچہ اسلامی حکومت نہیں تھی، تاہم اس کی متعدد خصوصیات اس کے اندر موجود تھیں جن کے اس ملک کے باشندوں کی زندگی پر بڑے خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔ انسانی اخوت اور مساوات کا تصور، قانون کی بالادستی اور سب کے لیے انصاف کی فراہمی اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے حکمرانوں کی کوششیں اس کے چند نمایاں پہلو تھے۔ ان کے زیر سایہ مذہبی رواداری کا ایسا اعلیٰ معیار قائم ہوا جس کا اس سے پہلے تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود اسلام کو برصغیر میں وہ کامیابی نہیں ملی جو اسے دوسرے ممالک میں ملتی رہی تھی۔ اپنے طویل دور اقتدار میں مسلمان اقلیت میں تھے اور اب بھی ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔ اگر ملک کی تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو بھی اقلیت ہی میں رہتے۔ یہ جہاں اس بات کی ایک ناقابل تردید دلیل ہے کہ اپنے طویل دور اقتدار میں مسلمانوں نے تبدیلی مذہب کے لیے طاقت کا استعمال نہیں کیا وہیں اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ یہ ملت اسلامیہ کی ایک بڑی ناکامی کی مظہر ہے۔ امت پر عائد دعوت کے ابدی فریضہ کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا پتہ لگائیں جو اس صورت حال کے لیے ذمہ دار رہے ہیں اور ان کے تدارک کی سبیل کریں۔ اس تناظر میں یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اتنی طویل ہمسایگی کے باوجود ہم برادران وطن کو اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے کس حد تک واقف کرا سکے ہیں نیز یہ کہ ہم ان کے مذہب اور معتقدات سے کس حد تک واقف ہو سکے ہیں۔ ہمیں اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ بلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ فریضہ اس وقت تک بخوبی انجام نہیں دیا جاسکتا جب تک مخاطب کے بنیادی اعتقادات اور نظریات سے واقفیت نہ ہو۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس سرزمین میں اپنے طویل قیام کے باوجود ہم برادران وطن کے مذہب اور بنیادی اعتقادات سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض ادارے اور افراد اس میدان میں سرگرم ہیں لیکن کام کی وسعت، نوعیت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے تمام تر قدر و قیمت کے باوجود یہ یکسر ناکافی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام ایک ہزار سال پہلے مشہور اسلامی محقق ابوریحان البیرونی (۹۷۳ - ۱۰۴۸) نے انجام دیا۔ البیرونی سلطان محمود کی فتوحات کے جلو میں ہندوستان آیا جب یہاں کے باشندوں کے دل و دماغ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کے شدید ترین جذبات پائے جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس نے برہمن اسکالرز سے جو غیر برہمن ہندوؤں کو بھی علم کا اہل نہیں

سمجھتے تھے، سنسکرت سیکھی اور براہ راست ان کے مذہب، فلسفہ اور دوسرے علوم کا اتنی ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا اور اپنی تحقیقات کے نتائج کو اتنے علمی اور معروضی انداز میں پیش کیا جس کا تصور آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مشکل ہے۔ مسلم دور حکومت میں اس طرح کی کئی اور قابل قدر کوششیں ہوئیں لیکن واقعہ ہے کوئی بھی البیرونی کی ہمسری کا دعویٰ نہ کرسکا۔ لیکن آج ہم میں سے کتنے لوگ البیرونی کے نام اور کام سے واقف بھی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ یہ امر ہے کہ ہمارے بارے میں اہل وطن کی معلومات اس سے بھی کم ہیں جتنی ہماری ان کے بارے میں۔ ماضی میں جو لوگ ہمارے اسلاف کے ربط میں آتے تھے وہ ان کے معاملات اور اخلاق سے متاثر ہوتے تھے۔ ہمارے اندر وہ اخلاق اور اوصاف باقی نہیں رہے۔ ساتھ ہی خیر امت ہونے اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس بھی جاتا رہا، نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کے باشندوں کی غالب اکثریت مسلمانوں کے بارے میں ابتدائی معلومات سے بھی عاری ہے اور ان کے بارے میں حد درجہ منفی اور دور از کار خیالات رکھتی ہے۔ یہ صورت حال عوام تک محدود نہیں اور نہ حاشیہ کے انتہا پسند طبقوں تک بلکہ اس کا دائرہ روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں تک محیط ہے۔ اس کی ایک تکلیف دہ مثال گذشتہ دنوں اس وقت سامنے آئی جب مدھیہ پردیش کے ایک مسلم طالب علم کی عرضی سپریم کورٹ میں زیر سماعت تھی کہ نرملا کانونٹ ہائر سکنڈری اسکول میں تعلیم کے دوران اسے داڑھی رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے جس کی اسکول کی انتظامیہ کی طرف سے ممانعت کردی گئی تھی۔ اس معاملہ کی سماعت کرنے والی بنچ کی سربراہی جسٹس آر۔ وی۔ رودرن کررہے تھے۔ دوسرے جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو تھے۔ عدالت نے طالب علم کو اسکول کے قوانین کی پابندی کی ہدایت کی۔ دوران سماعت جسٹس کاٹجو نے داڑھی اور برقعے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ حد درجہ تشویش ناک ہیں۔ اب جب کہ انہوں نے اپنے ان خیالات کے سلسلہ میں افسوس کا اظہار کردیا ہے ان کے بارے میں کچھ زیادہ کہنا سننا مناسب نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ اظہار افسوس اردو کے بعض اخبارات تک محدود رہا ہے اور ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کی بڑی اکثریت اس سے بے خبر ہے چنانچہ اس سے جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی نہیں ہوسکی۔ مزید براں اس مسئلہ کا یہ پہلو اب بھی توجہ طلب ہے کہ عدالت عظمیٰ کے ایک فاضل جج کی طرف سے دوران سماعت ان خیالات کا اظہار کیا گیا۔ جسٹس کاٹجو ایک امتیازی حیثیت کے حامل جج ہیں اور اپنی روشن خیالی اور لبرل نظریات

کے لیے معروف ہیں۔ان کی علمی دل چسپیوں کی فہرست بہت طویل ہے جس میں تاریخ اور اردو شامل ہیں۔وہ اپنے مطالعہ اور غور وفکر کے نتائج کو قرطاس وقلم کے ذریعہ پیش کرنے میں دل چسپی بھی رکھتے ہیں اور اس کا سلیقہ بھی۔ان کی تحریریں سنجیدہ، متوازن اور فکر انگیز ہوتی ہیں۔ان کی روشن خیالی اور لبرل طرز فکر کا انعکاس ان کے فیصلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔بعض اہم مسائل میں انہوں نے اپنی بالکل نئی راہ نکالی ہے۔عدلیہ کی فعالیت اور توہین عدالت کے سلسلہ میں ان کے فیصلے اور خیالات ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ذاتی لیاقت اور صلاحیت کے علاوہ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کا قانون اور سیاست سے گہرا تعلق رہا ہے۔ایسا لائق اور فاضل جج اگر داڑھی اور برقع جیسے اسلامی شعائر کو طالبان کی علامت قرار دے اور ان کے لیے ہندوستان کے جمہوری ڈھانچہ میں کوئی گنجائش نہ پائے تو اسے کیا کہا جائے۔جہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فاضل جج کے منصب کا تقاضا تھا کہ انہیں اس سلسلہ میں صحیح معلومات حاصل ہونی چاہیے تھیں۔وہیں ہمیں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ ہم اپنے دین کی اساسی تعلیمات سے بھی ملک کے اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ طبقہ کو متعارف نہیں کرا سکے ہیں۔

یہ فیصلہ کرنا کہ اسلام میں داڑھی اور پردہ کی کیا حیثیت ہے، عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔کسی فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی مخصوص فرد یا افراد کے اپنے عمل یا بے عملی کا مظہر ہوتا ہے، اس سے اس فریضہ کی اہمیت اور حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔داڑھی اور پگڑی سکھ مذہب کے بنیادی اعمال میں داخل ہیں اور اسی بنا پر سکھوں کو ہر سطح پر اس کی اجازت ہے، کچھ دنوں پہلے واشنگٹن پوسٹ میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق ۳۰/ برس کی عمر تک کے ۲۵ فیصد سے بھی کم سکھ پگڑی استعمال کرتے ہیں، اگرچہ یہ ان کے مذہب کا جزء لاینفک ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پرائیویٹ اقلیتی اداروں کو اس حد تک اپنے قوانین بنانے کا حق حاصل ہے تو کیا ایک اقلیتی مسلم ادارہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے غیر مسلم طلبہ کے لیے داڑھی رکھنا اور برقع پہننا لازمی قرار دے دے۔۱۹۹۸ء میں فرید کوٹ کے دشمیش انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ ڈنٹل سائنسز نے ایک سکھ طالب علم یدوندر سنگھ کو اس بنا پر داخلہ دینے سے انکار کر دیا کہ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔عدالت نے انسٹی ٹیوٹ کو یدوندر سنگھ کو ۷/ لاکھ ہرجانہ ادا کرنے کا حکم دیا۔لیکن محمد سلیم داڑھی رکھ کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتا اور عدالت عالیہ بھی اس کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتی۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

مقالات

مولانا دریابادی کی قرآنی بصیرت

پروفیسر ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی

بصیرت ایک وسیع الجہات اور عریض المعانی لفظ ہے، اس میں ظاہری بصارت کے ساتھ اندرونی بصیرت شامل ہے، اس کے معانی ''عقل، زیرکی، دانائی، عبرت، شاہد، حجت'' کے علاوہ ''سچی فراست'' بھی بتائے گئے ہیں (مصباح اللغات)، وہ مطالعہ ومشاہدہ، غور وفکر، تدبر وتعقل، علم وفضل اور حواسِ خمسہ ظاہرہ اور حواسِ خمسہ باطنہ کے تفاعل سے پیدا ہوتی ہے، ان سے زیادہ وہ عطیۂ الٰہی ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس کو حکمت عطا ہوتی ہے وہ خیر کثیر سے مالا مال ہوجاتا ہے، قرآن مجید نے متعدد آیات کریمہ میں اس عطائے ربانی کا ذکر کیا ہے اور بہت سے مقامات عالیہ پر اس کی عطا اور فیضان کا طریقہ بتایا ہے (قرآن کریم نے دو سورتوں میں لفظ بصیرت استعمال کیا ہے: یوسف: ۱۰۸:...... اُدْعُوْا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، ص ۱۹۲، دلیل پر قائم ہوں میں (بھی) اور میرے پیرو (بھی) - دریابادی)۔ سورۂ قیامہ: ۱۴: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ سوجھ ہے ...... عبد القادر دہلویؒ، شاہ دہلویؒ نے اول الذکر میں بصیرت کا ترجمہ سمجھ بوجھ کیا ہے، شاہ ولی اللہ نے ''حجۃ'' ترجمہ کیا ہے، ''حکمۃ'' بیس مقامات پر آیا ہے، سورۂ بقرہ: ۲۶۹، ان میں اہم ترین ہے)۔

قرآنی بصیرت اور بھی نادر ونایاب صفت ہے اور اس سے ہر مطالعہ کرنے والا اور ترجمہ و تفسیر کرنے والا بہرہ ور نہیں ہوتا، قدیم وجدید دونوں زمانوں میں کتنے ہی عالمان کتاب اور

سابق صدر شعبہ وڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

مفسرانِ قرآن گزرے ہیں کہ ان کو قرآنی بصیرت نہیں ملی اور ملی تو بہت کم ملی، ان کے مقابلے میں بہت سے مفسرین و مترجمین اور صاحبان و صاحبات علم ہیں جن کو قرآنی بصیرت سے حصۂ وافر ہی نہیں بہرۂ کامل ملا، بلاشبہ وہ انسانی بساط، بشری عقل و فکر اور آدمی کی صلاحیت کے مطابق ہی تھا جس کو انفرادی دائروں نے اور بھی محدود کر دیا تھا، ان چیدہ خاصان بصیرت میں بھی چند عبقری شخصیات رہی ہیں جو قرآنی بصیرت کی بیکراں جہات میں سے بیشتر کی حامل رہی ہیں۔ (عبقری ماہرین قرآنیات میں ہر مفسر نے اپنے مذاق کے مطابق شخصیات کا تعین کیا ہے جو بسا اوقات جانب دارانہ ہوتا ہے جیسے دریابادی نے مفسر تھانوی کو قرار دیا ہے، حکیم الامت: ۱۷۴، ایک بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ طبری، رازی، ابن کثیر، زمخشری، قرطبی، متقدمین میں اور آلوسی، تھانوی، دریابادی متاخرین میں عبقریات میں سے ہیں، شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزند عبدالقادر دہلویؒ ترجمہ اور عوام و خواص دونوں کے لیے مفیدتر اور وسیع اثرات کے مالک ہیں، تجزیۂ آخر میں اس پر مختصر بحث آتی ہے)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۶/ مارچ ۱۸۹۲-۶/ جنوری ۱۹۷۷ء) کم از کم اردو تفسیری میدان میں ان چند عبقریات میں شامل ہیں، مولانا موصوف نے بلاشبہ اپنے پیش رو مفسرین، مترجمین، شارحین اور متعدد دوسرے اہل علم کی کاوشوں سے سب کی طرح استفادہ کیا ہے، تفسیر ماجدی کے اولین افتتاحیہ میں انہوں نے ''لغت، لغات القرآن، اعراب القرآن، قرآنیات کی جامع کتابیں، عربی تفسیریں، فقہی تفسیریں، اردو تفسیریں'' کی سرخیاں لگائی ہیں اور ان سے بساط بھر استفادہ کیا ہے اور بار بار نقل کی جانے والی کتب کی تعداد ۲۹ ہے، مولانا دریابادی کی قرآنی بصیرت ان کے مطالعہ کی کثرت سے زیادہ ان کی جذب و انجذاب اور نقد و نظر کی صلاحیتوں کی پیداوار ہے۔ (ملاحظہ ہو: عبداللہ عباس ندوی کا مضمون ''تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت''، تفسیر ماجدی، لکھنؤ طباعت ۱۹۹۵ء، ۱/ ۹۹۸ - ۱۰۰۸، مولانا ندویؒ نے ان کی آٹھ خصوصیات کا ذکر کیا ہے: اخلاص، علم، مرشد کی رہنمائی، کتب سماویہ سے استفادہ، تفسیر ماجدی قدماء کی جامع، قرآن کی عظمت پیدا کرتی ہے، مذاہب منحرفہ اور فرق باطلہ کا ابطال کرتی ہے)

دریابادی نقد و نظر اور قرآنی بصیرت کا اولین نقش تفسیر ماجدی کے اس اولین افتتاحیہ

کے اندر تبصروں کی شکل میں ملتا ہے، بہر حال وہ اپنے ذاتی تجربے، شخصی مطالعہ، انفرادی فہم پر مبنی ہیں اور دوسروں کے تبصروں اور نقدوں سے مستفاد بھی لگتے ہیں لیکن ان دریابادی تبصروں میں روایتی لکیر کی فقیری نہیں ہے، بالعموم غلو اور مبالغہ بھی نہیں ہے، ان میں فکری توازن اور علمی گہرائی زیادہ ہے، چند تبصروں سے دریابادی نقد و نظر والی بصیرت اجاگر ہوگی۔

''عربی تفسیروں میں یکسانیت و تکرار بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے، یعنی ایک مفسر جو پہلے لکھ گیا ہے، اکثر بعد کے آنے والے اسے گویا آنکھ بند کر کے یعنی بلا جرح و نقد نقل کرتے چلے گئے ہیں اور بہت جگہ لفظ تک نہیں بدلے ہیں لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف تنوع و رنگا رنگی بھی اچھی خاصی ہے، ہر بڑے مفسر کا جیسے ایک مستقل مذہب و مسلک ہے اور اس کے مسافر اسی کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں''۔ (۱۷-۱۸)

مولانا دریابادی ان چند ناقدین میں سے ہیں جنہوں نے مفسرین مشرق و مغرب کے امتیاز و فرق کو سمجھا اور بتایا ہے ''مفسرین کی اکثریت مشرقی ہے...... لیکن دو بڑے مفسر مغرب کے بھی ہیں، ایک امام قرطبیؒ اور دوسرے محدث ابو حیان غرناطیؒ کہ یہ دونوں اسپین کے تھے، اگر مطالعہ ذرا غور سے کیا جائے تو مشرق و مغرب دونوں کی ذہنیت اور طریق فکر کا فرق ان تفسیروں میں جھلکتا ہوا نظر آئے گا......''۔ (۱۸)

''مذاق طبع کے لحاظ سے بھی مفسروں کی تقسیم یا درجہ بندی کی جاسکتی ہے، کسی کے ہاں سارا زور روایات حدیث و آثار صحابہؓ پر ہے اور کوئی نحوی ترکیبوں کے حل اور صرفی اشتقاق کے سلجھانے میں لگا ہوا ہے اور کوئی کوئی ایسے بھی ہوئے جن میں شان جامعیت موجود ہے، مثلاً متقدمین میں امام رازی اور متاخرین میں آلوسی بغدادی کہ ان دونوں کے ہاں کہنا چاہیے کہ سب ہی کچھ موجود ہے''۔ (۱۸)

فارسی تفسیروں پر نقد دریابادی چشم کشا ہی نہیں عبرت خیز بھی ہے: ''فارسی تفسیروں میں کوئی قابل ذکر کتاب نظر نہ آئی، ہاں ترجمہ کی حد تک شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''فتح الرحمٰن'' کا نام لیا جاسکتا ہے''۔

اردو تفسیریں نظرِ دریابادیؒ میں وقیع تر مقام کی مالک ہیں، بیان القرآن اشرف علی تھانوی کے بارے میں ان کا انتہائی تبصرہ ہے: ''اسے اگر اردو کی ساری تفسیروں کا سرتاج سمجھا جائے تو

شاید مبالغہ نہ ہو''، فتح محمد تائب لکھنوی کی خلاصۃ التفسیر کو ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مصداق'' قرار دیا ہے، امیر علی ملیح آبادی کی مواہب الرحمٰن کے بارے میں تبصرہ ہے: ''کہنا چاہیے کہ عربی کی ساری ہی متداول تفسیروں کا جوہر کھنچ کر اس کے اندر آ گیا ہے''، محمد علی لاہوری کی بیان القرآن کو ''محض ترجمہ کی حد تک قابل قدر مانا ہے''، باقی بلا تبصرہ مذکور ہیں۔ (۱۸)

ترجمہ کی مشکلات اور قواعد: ایک متفقہ عقیدہ اور مسلمہ ایقان ہے کہ انسانی کاوشوں میں ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا مشکل ہے، اصل اور ترجمہ کی زبانیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں، ان میں نحوی وصرفی ساخت اور تعبیر سے زیادہ ان کا مزاج جداگانہ ہوتا ہے، اس لیے الفاظ ومفردات کا ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، فقروں، جملوں اور عبارتوں کا ترجمہ کرنا دلدل میں تیرنا ہے، ترجمہ کی ان مشکلات کا معاملہ کلام الٰہی میں اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، بلاشبہ اور بلا تکلف وتردد اس کو ناممکن کہا جا سکتا ہے، اصلاً ترجمہ الفاظ وعبارات کے معانی کی ترسیل ہے، اسے متعدد اہل علم ولغت نے ترجمہ معانی سے بجا طور سے تعبیر کیا ہے۔ (سعودی عرب سے چھپنے والے تمام تراجم قرآن کریم بالخصوص حضرت شاہ کے ''فتح الرحمٰن'' کے سرورق پر ''ترجمة معانية الى اللغة الفارسية'' لکھا گیا ہے، مولانا دریابادی بھی اسی فکر کے قائل ہیں اور دوسرے بھی، اگرچہ بیشتر مترجمین ترجمہ الفاظ اور ترجمہ معانی کا فرق نہیں سمجھ پاتے، وہ ہے بھی مشکل چیز)

تفسیر ماجدی میں مولانا دریابادی نے ان مشکلات ترجمہ کا مختصر ذکر کیا ہے مگر وہ اپنی جہات کے لحاظ سے وسیع تر ہے، برصغیر پاک وہند میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''مقدمہ فتح الرحمٰن'' میں مختصراً اور ''مقدمہ درفن ترجمہ'' میں مفصلاً اس پر بحث کی ہے، انہوں نے موخر الذکر میں بالخصوص فارسی زبان میں قرآنی تعبیرات کے ترجمہ کے مشکلات بیان کر کے ان کے قواعد بھی بیان کیے ہیں، دوسرے اہل علم نے اردو، فارسی اور دیگر زبانوں میں قرآن مجید کے ترجموں کی مشکلات کا عمومی ذکر کیا ہے مگر قواعد اور رہنما خطوط سے بحث نہیں کی، کم از کم اردو ترجمہ قرآنی کے لحاظ سے مولانا دریابادی کی مختصر بحث بھی بہت قیمتی ہے کہ وہ ایک دانائے راز اور ماہر زبان کے قلم سے نکلی ہے۔ (شاہ ولی اللہ دہلوی، المقدمہ فی قوانین الترجمہ/مقدمہ درفن ترجمۂ قرآن

(فارسی)، مخطوطہ، اردو تراجم مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، برہان دہلی، اکتوبر ۱۹۴۵ء؛ اس میں متن بھی شامل ہے)

افتتاحیہ نمبر (۲) کا آخری پیراگراف مولانا مرحوم کی فنی مہارت اور تنقیدی صلاحیت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے: ''......ترجمہ جو بھی کرے گا انہیں محاورات سے کرے گا، جو وہ اپنے گرد و پیش بول چال میں پائے گا اور محاورات کا حال یہ ہے کہ سو برس کی مدت تو خیر بہت بڑی ہوئی، پچاس ہی برس میں یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں اور کتنے ہی کہنہ و فرسودہ ہو جاتے ہیں......شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی زبان اپنے زمانہ میں ترجمہ کی بہترین زبان تھی لیکن آخر کب تک ثبات و قیام اسے بھی رہتا، جدید نسل کے لیے اب وہ پچاس فی صد نا قابل فہم ہوگئی ہے...... نمونے کے طور پر صرف دس پانچ لفظ سن لیجیے: ''صاحب'' پہلے مالک و حاکم کو کہتے تھے، اب صرف رفیق کو کہتے ہیں اور ہلکی تعظیم کے موقع پر بولتے ہیں، ۲-''تماش بین'' پہلے عیاش کو کہتے تھے، اب عام تماشائی کے معنی میں بولتے ہیں، ۳-''رنج'' کا لفظ پہلے بیماری کے لیے بھی عام تھا، اب صرف غم کے مترادف ہے، ۴-''چالاک'' پہلے اردو میں متحرک کو بھی کہتے تھے، اب صرف زیرک و دانا کو کہتے ہیں، پہلوئے ذم لیے ہوئے، ۵-''بہرہ'' پہلے مطلق حصہ کے معنی میں آتا تھا، اب بجز منفی ترکیب ''بے بہرہ'' کے یا فارسی ترکیب (مثلاً بہرہ ور) اردو کے استعمال میں نہیں، مولانا مرحوم اسی طرح دریا بہ معنی سمندر، صرف دریا، بندی خانہ بہ معنی جیل رجیل خانہ یا قید خانہ، آشنا اور آشنائی بہ معنی دوست اور دوستی، اب دونوں میں پہلوئے ذم کے ساتھ، اسی طرح یار اور یاری اور پاداش بہ معنی جزا یا معاوضہ اب سزا یا جرمانہ کی مثالیں ہیں۔(۱/ ۲۵-۲۶)

غور و فکر، تدبر و تعقل اور پس بینی و باز رسی کے نتیجہ میں مولانا دریابادیؒ نے طبع ثانی کے افتتاحیہ میں ترجمہ کی مشکلات پر مزید لکھا ہے، اس کا آغاز ہی ترجمہ کی مشکلات سے ہوتا ہے، عام انسانی کاوشوں اور بشری کتابوں کی ترجمہ نگاری کے بعد ''الکتاب'' کی ترجمہ نویسی پر کلام کیا ہے، کلام الٰہی کی بے کرانی اور رفعت اور انسانی فہم کی محدودیت اور لسانی عاجزی پر عام تبصرہ کے بعد مولانا دریابادیؒ نے اردو میں عربی کلام ربانی کے ترجمے کی مشکلات اور دقتوں کا متعدد لسانی مباحث کے حوالے سے ذکر کیا ہے، اس نسبتاً مفصل بحث میں کئی جہات کا احاطہ کیا ہے:

''.......عربی میں زور وتاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں، جیسے: ''انہ ھو یبدئ ویعید، انك انت العزیز الحکیم ، اننا سمعنا ، اننی انا اللّٰہ ......'' وغیرہ، اب اگر لفظی ترجمہ کی دھن میں اس قسم کی ترکیبوں میں اردو میں بھی ضمیر غائب ''وہ'' یا ضمیر حاضر ''تو'' یا ضمیر متکلم ''میں'' یا ''ہم'' دہرا کر تہرا کر لائی جائے تو اردو عبارت تو غارت ہی ہو جائے، لازماً اردو میں اس مفہوم کو لانے کے لیے اردو ہی کے اسلوب سے کام لینا پڑے گا۔

اردو میں حال اور مستقبل کے دو صیغے مستقل اور الگ الگ ہیں، عربی میں دونوں کے لیے ایک ہی صیغہ مضارع کا ہے جسے بجنسہٖ اردو میں لے آنے کی کوئی شکل ہی نہیں، اسی طرح تثنیہ کو جمع سے ممتاز کرنے کے لیے اردو میں لفظ ''دو یا دونوں'' کی تصریح لازمی ہے۔

عربی کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ فقرے میں فعل کو مکرر لے آتے ہیں، کہیں فعل ہی کی حالت میں اور کہیں اسے اسمی یا مصدری صورت دے کر اور کہیں موصوف کی صفت خود اسی لفظ سے لے آتے ہیں: اعذ بہ عذابا ، فیمیلوا میلا ، فرضتم لھن فریضة ، مکرا مکرتموہ ، قتلوا تقتیلا الخ، اردو میں اس موقع کے لیے کوئی دوسرا ہی لفظ لانا پڑے گا، کہیں ''بہت، کہیں بڑا، کہیں خوب، کہیں خوب ہی، کہیں مارکے''۔

خالص عربی تراکیب جیسے ''فزادھم اللہ مرضاً اور غیر المغضوب علیھم وغیرہ کے اردو ترجمہ میں صیغہ یا زبان بدلنی پڑتی ہے۔

''ایک بڑا مرحلہ لغات اضداد کا ہے، عربی میں متعدد لفظ ایسے ہیں جو متضاد مفہوموں کے لیے آتے ہیں، مثلاً شراء کہ خریدنے کے لیے بھی آتا ہے اور فروخت کرنے کے لیے بھی، یا رجاء کہ امید وبیم دونوں موقعوں پر آتا ہے، یا قرء کہ اس کے مفہوم میں پاکی بھی داخل ہے اور ناپاکی بھی''۔

اور اسی سے ملتا ہوا مسئلہ اختلاف قرأت کا ہے جہاں دو دو قرأتیں وارد ہوئی ہیں اور دونوں متواتر، وہاں اعراب بدل گئے اور قدرةً اس کا اثر معنی ومفہوم پر پڑا ہے: ''فا مسحوا برؤسکم وارجلکم'' میں ارجلَکم کی قرأت نصب کے علاوہ جر کے ساتھ (ارجلِکم) بھی متواتر ہے۔

مولانا موصوف نے اس بحث میں انتشار ضمائر، اردو میں چلے ہوئے الفاظ قرآنی، ان

کے وسیع وعمومی معانی میں سے صرف ایک متعین ومحدود اصطلاحی معنی اور اردو میں اسی آخری کے چلن جیسے قتل، رب، جہاد، وثوق، شراب، زکاۃ، خیر وغیرہ، قرآن میں متجانس کیفیات یا مماثل اشیاء کے لیے کئی کئی الفاظ مگر اردو میں صرف ایک لفظ کا چلن جیسے ''حیۃ، جان، ثعبان'' کے لیے صرف سانپ اور متعدد دوسرے الفاظ وتعبیرات سے بحث کی ہے۔ (۱/ ۱۰ - ۱۲؛ ڈرنا/ڈرانا کے لیے سات قرآنی مادے: خوف، خشیت، وجل، تقویٰ، حذر، اشفاق، رہبۃ یا جماعت وگروہ کے لیے سات الفاظ: فئۃ، طائفۃ، حزب وغیرہ)

تفسیر وتشریح اور تاویل وتعبیر قرآن کریم: اردو اور عربی تفسیروں کے حوالے سے مولانا دریابادیؒ نے متقدمین اور پیش رووں کی بے محابا تقلید پر سخت نقد کیا ہے، انہوں نے ایک اصولی بات بڑی دردمندی کے ساتھ لکھی ہے جو ان کی اکابر سے عقیدت ومحبت کے ساتھ ان کی فنی بصیرت کو اجاگر کرتی ہے'' کیسے ممکن ہے کہ قرآنیات کا کوئی طالب علم استاد سے اور اگلے ماہرین فن کے نتائج تحقیق سے بے نیاز رہ کر اس کی منزلیں طے کر لے......ان حضرات کی تلاش، تفحص، تحقیق کی داد دل سے دیجیے، ان کی سپاس گزاری کے لیے قلب کی گہرائیوں کو وقف کر دیجیے...... لیکن اس انتہائی قدر ومنزلت اور آخری احترام واعتراف کے بعد بھی یہ عقیدہ ذہن میں تازہ رکھیے کہ نبی معصوم کے بعد کوئی بھی معصوم امت میں نہ ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے، اس لیے فکر، فہم و اجتہاد کے لحاظ سے ہر بڑے سے بڑا محقق بھی غیر معصوم ہی ہے، اس لیے پیروی کسی کے بھی قول کی، ہر حال میں کیے جانا اور صریح دلیل مخالف کے باوجود کرتے رہنا طریق حق وصواب نہیں ......لیکن دوسروں کی معصومیت سے انکار کے معنی خود اپنی معصومیت کے اثبات کے واللہ باللہ نہیں اور نہ اس سے یہ خوش اعتقادی اپنی تلاش ویافت کے لیے لازم آتی ہے کہ جیسے یہ علم وتحقیق کا حرف آخر ہے اور جزم ووثوق کے ساتھ قابل اعتماد، حاشا اس کا وہم بھی نہ آنے پائے: فوق کل ذی علم علیم''۔(۱/ ۱۵)

مفسر کے لیے جو اوصاف طہارت وتقوی اگلوں نے لکھے ہیں مولانا دریابادی ان کو بلا تردد تسلیم کرتے ہیں مگر ان پر کئی اضافے بھی کرتے ہیں'' ...... جب ایک بار سوال یہ چھڑ گیا اور طے پا گیا کہ قرآن کریم غیروں اور منکروں کے لیے بھی ہے تو تفسیر نگار کے لیے علوم عصری سے

بہرہ مند ہونا بھی کچھ کم ضروری نہیں رہ جاتا''، مولانا مرحوم نے اس کے بعد متعدد آیات و احکام قرآن کے حوالے سے ان علوم عصری سے واقفیت کا ہونا بیان کیا ہے، مثلاً ترکہ و وراثت کے مسائل حل کرنے کے لیے علم الحساب، ریاضی (ارتھمیٹک) کی واقفیت ضروری ہے، علوم طبعی و فلکیاتی، جغرافیہ و تاریخ اور خالص عقائد و عبادات اور مذہبیات وغیرہ سے واقفیت کے بغیر جدید دور میں تفسیری فرائض ادا کرنا بالکل مشکل ہے، مثلاً سورۂ بقرہ - ۱۷۷:'' لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ'' نے مترجمین و شارحین کو حیرت میں ڈال دیا ہے، تمام ترجموں اور تفسیروں میں ''مشرق رخی یا مغرب رخی کا نیکی یا عمل خیر ہونا...... مشترک ہے، حالاں کہ قرآن مجید سرے سے اس کی نفی کر رہا ہے، مفسرین رحمہم اللہ بیچارے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ دنیائے شرک میں شرک جلی کی ایک قسم سمت پرستی بھی ہے، کلام مبین ضرب اسی عقیدہ پر لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ سمت پرستی میں کیا رکھا ہے جو تم کسی متعین سمت کو مقدس فرض کیے ہوئے ہو......''۔ (۱/ ۲۲- ۲۳)

دریابادی بصیرت و نقد و نظر قرآنی کا ایک نادر و نایاب ثبوت اس بحث میں ملتا ہے جہاں قرآن مجید کو بہ یک وقت مطلق اور مقید بتایا ہے، ''قرآن مجید جہاں یکتا و منفرد اور حیثیتوں سے ہے، وہاں اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ بہ یک وقت زندہ جاوید اور ہمہ وقت تازہ اور عالمی یا آفاقی صحیفۂ ہدایت بھی ہے اور بہ قید زمان و مکان ایک متعین ملک اور متعین ماحول کے لیے مخصوص بھی یعنی ایک طرف تو وہ دنیا کے ہر ملک و اقلیم کے لیے ہے، اس کی مخاطب چین و جاپان، ایران و ہندوستان، یورپ اور امریکا اور افریقہ، مشرق، مغرب، شمال و جنوب کی ساری قومیں ہیں اور وہ بھی کسی مخصوص، محدود زمانہ کی نہیں بلکہ پہلی صدی ہجری کی طرح چودھویں صدی ہجری کی، خواہ ان کی تہذیب و تمدن اور ماحول کچھ بھی ہو اور دوسری طرف اس کی مخاطب اول و براہ راست ایک مخصوص ملک عرب کی وہ قوم تھی جو تاریخ کے ایک متعین زمانہ ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں موجود و آباد تھی اور اپنی ایک مخصوص ذہنیت، ثقافت و معاشرت اور مخصوص فکری و وجدانی حیثیت کے ساتھ - قرآن مجید کی یہ دوگانہ، یعنی ایک طرف عالمی و آفاقی اور دوسری طرف قومی و وطنی حیثیت موجود ہی نہیں بلکہ برابر ساتھ ساتھ چل رہی ہے، گو ظاہر ہے کہ ترتیب زمانی

کے لحاظ سے یہ دوسری حیثیت پہلی پر مقدم ہے'' (۱/ ۱۳، نیز ۱/ ۱۲۸: ''......اور قرآن علاوہ اور دوسری حیثیتوں کے ایک کلام معجز اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ اپنی اسی دوگانہ حیثیت اطلاقی و مقید کو شروع سے آخر تک قائم رکھے ہوئے ہے''۔

بالعموم ہمارے قدیم و جدید روایتی مفسرین و شارحین اخلاص نیت، صالحیت و مقبولیت اور طہارت و تقوی پر بہت زور دیتے ہیں بلکہ تفسیر قرآن کریم کے لیے ان ہی کو اصل کلید سمجھتے ہیں، دریابادی تبصرہ و تنقید سے ان کی جبینوں پر شکن پڑ جائے گی، جب وہ صرف ان ہی چیزوں پر انحصار کی تردید کرتے ہیں''، اس لیے لازمی ہے کہ جدید مفسر و شارح تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی اور یہودیت و نصرانیت، مجوسیت اور عرب اور نواح عرب کے شرکیہ مذاہب سے فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں (خصوصاً فلکیات) سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو، ورنہ باوجود تدین و تقوی، صالحیت و مقبولیت کے سخت غلطیوں کا شکار ہو جائے گا اور اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا، کہیں حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہو جانا بیان کرے گا......مفسر کا محض صالح و متقی ہونا ہرگز اس کی ضمانت نہیں کہ اس کی تاریخی، جغرافی اور عام سائنسی معلومات بھی صحیح ہیں (۱/ ۱۴)، اسی کے ساتھ مولانا مرحوم نے اس خطرناک رجحان سے بھی خبردار کیا ہے کہ مختلف ادوار انسانی کے سائنسی نظریات اور سماجی و معاشی خیالات سے کتاب الٰہی کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے بجائے قرآنی سائنسی اور سماجی بیانات کو اٹل اور یقینی جان کر معاصر نظریات کے تناظر میں ان کو بیان کیا جائے، تاکہ معاصرین سمجھ سکیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نظریات انسانی ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ (۱/ ۱۴ و مابعد)

گذشتہ سے پیوستہ: پیش رو مفسرین اور شارحین سے استناد کرنے کا ایک نیا طریقہ دریابادی ان کی قرآنی بصیرت پر دال ہے، وہ کسی آیت زیر بحث اور اس میں مذکور مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اپنی بات کہتے ہیں اور قدیم و جدید پیش رووں سے سند لاتے ہیں، اس باب میں ان کا انتہائی علمی انداز یہ ہے کہ وہ مفسرین و شارحین کے ضروری متعلقہ جملے اور فقرے ان کے نام سے ان کی زبان میں نقل کرتے ہیں، مولانا موصوف نے جو تبصرہ امیر علی ملیح آبادی کی

مواہب الرحمٰن پر کیا ہے وہ تفسیر ماجدی پر زیادہ صادق آتا ہے کہ تمام متداول تفاسیر کا جوہر کھینچ لیا ہے اور صرف تفسیروں پر ہی وہ اکتفانہیں کرتے بلکہ لغت و زبان اور متعدد دوسری شروح کی کتابوں کو سمیٹ کر اپنی بحث کو جامع بنا دیتے ہیں، دریابادی بصیرت کا ایک اور زاویہ یہ ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور ان کو الگ الگ رکھتے ہیں کہ خلط ملط نہ ہو اور اس میں وہ اختصار و جامعیت کا انتہائی دل نشیں طریقہ اپناتے ہیں جو ان کے کثرت مطالعہ سے زیادہ ان کی قرآنی فہم کا خوب صورت نتیجہ ہوتا ہے، چند مثالوں سے اس نادر و نایاب اور قیمتی اور وقیع طریقۂ تالیف کا اندازہ کیا جاسکے گا۔

''سورۃ الفاتحہ مکیہ ہے'' میں سورہ ، فاتحہ اور مکیہ تینوں کے بارے میں تمام ضروری تشریحاتِ مفسرین کو اختصار سے پیش کردی ہیں ، مثلاً سورہ کے لفظی معنی بلندی یا بلند منزل کی تائید میں لسان ، راغب ، ابوالبقا، مجاز کی عبارات ان کے الگ الگ حوالوں سے ہیں ، قرآنی سورت کے تسمیہ کی وجوہ پھر اسی طرح لسان ، ابوالبقا اور قرطبی سے نقل کی ہیں ، اس میں ابوالبقا کے دو حوالے / اقتباسات ہیں، قرآن مجید کی سورتوں کی تقسیم و ترتیب توقیفی ہے، اس مسئلہ کو قرطبی اور جامع ترمذی کی تفسیر سورۃ البرأۃ سے مستند کیا ہے، سورہ یا تمام سورتوں کے اسماء، ان کی تعداد، مکی اور مدنی تقسیمات کے علاوہ مولانا دریابادی نے رکوع (۵۴۰)، آیات (۶۶۱۶) کل الفاظ قرآن (۷۷۹۳۴)، کل حروف قرآن (۳۲۳۷۶۰) کو بھی اتقان کے حوالے سے اور دیگر کتب سے نقل کردیا ہے، اس طرح صرف دوڈھائی صفحات میں تمام ضروری معلومات جمع کردیے ہیں، جن کو دوسرے مفسرین و شارحین دسیوں اوراق میں نقل کرتے ہیں (۱/ ۴۱-۴۳)، بسملہ پر بحث دریابادی ناقص ہے اور مختصر بھی کہ وہ صرف حنفی نقطہ نظر بتاتی ہے اور قرآنی آیات سے اس کا تعلق نہیں جوڑتی البتہ اس کے مختلف الفاظ و تراکیب کے معانی پر ان کی بحث کافی قابل قدر ہے جو مختلف مفسرین و شارحین کی آراء سے مدلل و مستند ہے، اللہ، رحمٰن اور رحیم پر دریابادی بحث محدود بصیرت کا اظہار کرتی ہے، بلا شبہ اللہ اب اسم ذات بن گیا ہے مگر اصلاً وہ بھی اسم صفت ہے، رحمٰن کا ترجمہ دشوار جانا مگر رحمٰن و رحیم کا فرق واضح نہیں کرسکے، البتہ ان کی اور پھر پوری سورۂ فاتحہ کی تشریح اسی طرح مستند و مدلل ہے (۱/ ۴۳-۴۴): محض دس صفحات میں مولانا دریابادی نے

تمام متداول کتب وتفاسیر کا عطر کشید کر کے پیش کر دیا ہے جو بالکل نایاب ہے۔

تفسیر وتشریح آیات میں دریابادی طریق تالیف اسی طرح شروع سے آخر تک تمام اسلامی ماٰخذ سے استناد کرتا ہے، اس میں بھی ان کی دوررس نگاہ اور بصیرت اس خاص معنی کو تلاش کر کے اسے ابھار دیتی ہے جو اس لفظ قرآنی کی خاص الخاص وجہ ہے، سورۂ بقرہ - ۲: ''ذلك الکتب'' پر تمام اقتباسات اور استنادات میں نظر دریابادی میں زمخشری کی کشاف کا جملہ اس کی ایسی حقیقت کھولتا ہے جو مفصل ومشرح بحث بھی نہیں کھول سکتی، دریابادی نے اسے ''کتاب واحد'' بھی کہا ہے مگر زمخشری نے ''الکتاب الکامل'' قرار دے کر تمام دوسری کتب کو قرآن کریم کے مقابلہ میں ناقص بتا کر اس کے بلاغی معنی کی وہ ترسیل کی ہے جو صرف زمخشری جیسا ماہر بلاغت ہی کر سکتا تھا (۱/۴۷: ''معناه ان ذلك الکتاب هو الکتاب الکامل کان ما عداه من الکتب فی مقابلة ناقص'' نیز بعد کی تشریحات علماء؛ اس پر امام مزنی شاگرد امام شافعیؒ کا یہ تبصرہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر کتاب کے مطالعہ میں ہر بار کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ملے گی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے سوا ہر کتاب کے صحیح ہونے کا انکار فرمادیا: ''لو عورض کتاب سبعین مرة لوجد فيه خطأ ، ابی الله أن يكون کتاب صحيحا غير كتابه''۔

اسی طرح ''هدی للمتقین'' کا ترجمہ وتشریح کہ قرآن کتاب ہدایت ہے، صرف اللہ کا ڈر رکھنے والوں کے لیے کہ عملاً اس سے نفع صرف حق طلب اور جویائے ہدایت ہی حاصل کر سکیں گے، معنی ومدلول کی صحیح ترسیل کر دی ہے۔ (۱/ ۴۸ - ۴۹: بحوالہ ابن کثیر)

''غیب'' کی تشریح ہے: ''لغت میں شہود کی ضد ہے، ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو یا مشاہدہ وتجربہ سے باہر ہو، اس کی لغوی اور معنوی تائید میں لسان،، راغب کے علاوہ طبری، رازی کا حوالہ ہے لیکن خود دریابادی تشریح وتعبیر ان کی بصیرت پر مبنی ہے۔

پوری تفسیر ماجدی اس طریق تالیف پر استوار ہونے کے سبب تمام متقدمین وشارحین کے افکار عالیہ کی جامع بن گئی ہے، اس باب میں بہت کم اردو عربی تفاسیر اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں، حتی کہ مرشد تھانوی کی ام التفاسیر بھی صرف چند ماٰخذ پر منحصر ہے۔

جدید اور معاصر مفسرین وشارحین میں مولانا دریابادی نے مولانا تھانوی سے سب سے

زیادہ اکتساب فیض کیا ہے اور ان ہی کو سب سے زیادہ نقل بھی کیا ہے، مولانا دریابادی کا ایک وصف تمیز یہ ہے کہ وہ تھانوی تفسیری آراء کو ''مفسر تھانوی'' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں اور تھانوی معارف تصوف کو ''مرشد تھانوی'' کے حوالے سے، یہ التزام بھی انہوں نے پوری تفسیر ماجدی میں برقرار رکھا ہے، ''مفسر تھانوی'' کی تشریحات کی اس جگہ چند مثالیں دی جاتی ہیں کہ ''مرشد تھانوی'' کے حوالوں کا موقع دوسرا ہے کہ وہ سراسر ذوقی بھی ہے، ''مفسر تھانوی'' کو کہیں کہیں محقق تھانوی بھی کہا ہے مگر صرف ان ہی مقامات پر جہاں حضرت والا کی اپنی کوئی خاص تحقیق ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ-۵: ''واولئك هم المفلحون'' میں فلاح کے وسیع ترین معنی بیان کیے ہیں کہ ''وہ دنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے'' اور اسے حسب دستور کتب تفسیر و لغت سے مستند کیا ہے جیسے تاج اور مجاز وغیرہ، دوسرے اس ترکیب نے معنی میں حصر و تاکید پیدا کر دی، اس کو بیضاوی اور بحر سے مستند کر کے لکھتے ہیں کہ ''مفسر تھانوی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ حصر کا تعلق فلاح کامل سے ہے نہ کہ فلاح مطلق سے اور المفلحون سے مراد ''الکاملون فی الفلاح'' ہے، اس تشریح سے معتزلی عقیدہ کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ دونوں میں فرق نہیں کر سکے۔ (۱/ ۵۴-۵۵: مفسر تھانوی کے اقوال و تشریحات کے لیے ملاحظہ ہو: ۱/ ۹۶: قالو أتجعل فیها الخ ؛ ۱/ ۱۴۵: من بقلها الخ کی ھا کا ترجمہ ہر جگہ ساقط ہے)

رنگ تصوف: اپنی مرنجان طبیعت کے رجحان، ماحول کے ان گنت اثرات اور تعلیم و تعلق کے روابط نے تفسیر ماجدی کو ایک رنگ تصوف بھی دیا، اس عطا میں آلوسی بغدادی اور اشرف علی تھانوی جیسے جامع الجہات مفسرین اور شارحین کا غالباً سب سے زیادہ حصہ و بہرہ تھا، مولانا دریابادی کی جامعیت و بصیرت بھی اس سے دامن کش نہیں رہ سکتی تھی کہ بہرحال تصوف، اسلامی تہذیب میں ایک علم و عمل تو ہے ہی اس سے کنارہ کشی جامعیت کو متاثر کرتی جس طرح بعض بلکہ متعدد جدید مفسروں کو اس سے طبعی یا علمی مناسبت نہ ہونے کے سبب محروم کر گئی، دریابادی بصیرت کا خاص نتیجہ یہ ہے کہ تفسیر ماجدی میں رنگ تصوف فن تفسیر اور علم شریعت میں اپنا مقام حاشیہ کے مطابق ہی آسکا، (صوفیہ کرام کی تفاسیر میں رنگ شریعت ہی نہیں فن تفسیر اور علم تاویل ہی تصوف و طریقت میں فنا ہو جاتا ہے اور قرآن کریم کتاب تصوف بن کر رہ جاتا ہے، ملاحظہ ہو: محمد حسین

ذہبی کی کتاب ''التفسیر والمفسرون'' کا باب تفاسیر الصوفیہ، نیز عبداللہ انصاری، سہل تستری اور آلوسی پر تنقیدی مضامین؛ دوسری طرف معاندین تصوف کی تفاسیر کا معاملہ ہے کہ وہ طریقت وتصوف کے نام سے ہی بیزار ہیں اور اس کو غیر اسلامی شے سمجھتے ہیں)۔

استفادہ وکسب فیض تو آلوسی اور دوسرے متقدمین سے بھی اس باب میں کیا ہے مگر زیادہ عطیہ/عطایا مرشد کا ہی ہے، تفسیر ماجدی میں موقع موقع سے مولانا موصوف ''مرشد تھانوی'' کے حوالے سے بس کھانے میں نمک بھر ان کی تشریحات تصوف نقل کرتے ہیں، مولانا تھانوی عالم ومفسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم ترین شیخ طریقت اور صوفیہ عصر کے امام بھی تھے، تاہم مسائل سلوک کو حاشیہ ہی پر رکھا، اس جہتِ دریابادی پر تو ایک کامل تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے مگر یہاں صرف چند اقتباسات مرشد تھانوی کا رنگ ابھارنے کے لیے پیش ہیں۔

سورۂ بقرہ-۹: ''ومایخدعون الا انفسهم الخ کی شرح میں مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا مثلاً عداوت کا یا فریب کا ایسا ہی ہے جیسے حق تعالیٰ کے ساتھ کرنا''۔(۱/ ۶۱)

سورۂ بقرہ-۱۹: ''والله محيط بالكافرين مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر محض علم ہی کے لحاظ سے محیط نہیں بلکہ ذاتاً بھی محیط ہے، بلا کسی کیفیت کے.....'' ۱/ ۷۳: آگے عارف رومی کا شعر بھی ہے

اتصال بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را باجان ناس

سورۂ بقرہ- ۲۰: واذا اظلم عليهم قاموا الخ: مرشد تھانوی نے فرمایا کہ ایسا ہی حال اس سالک کا ہے جو حالت بسط میں طاعات میں لگا رہتا ہے اور حالت قبض میں چھوڑ بیٹھتا ہے''۔

سورۂ بقرہ-۵۷: كلوا من طيبٰت ما رزقنٰكم الخ ''مرشد تھانوی نے فرمایا کہ باوجود معاصی کے نعمتوں کا جاری رہنا استدراج اور سخت خطرناک ہے اور اس میں جاہل صوفیوں کو سخت دھوکا ہوا ہے، چنانچہ وہ کثرت جاہ و مال کو علامت مقبولیت کی سمجھتے ہیں''۔(۱/ ۱۳۸)

(مزید ارشادات مرشد تھانوی کے لیے: ۱/ ۸۷، ۱/ ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۶، ۱۲۸- ۱۲۹ وغیرہ ۷۶۴، ۹۶۲، ۹۷۳، ۹۷۸ وغیرہ)

مفسر و مرشد پر نقد دریابادیؒ: بایں ہمہ مولانا دریابادی اپنے مفسر تھانوی پر اکثر و بیشتر اور مرشد تھانوی پر کبھی کبھی نقد سے کام لیتے ہیں، اس باب میں مولانا موصوف کا اصول یہ ہے کہ کتاب و سنت اور شریعت کی تابع داری اصل ہے اور محض اکابر پرستی قطعی ممنوع ہے، مولانا دریابادی کی نظر میں مرشد تھانوی اور مفسر تھانوی کا جو مقام و مرتبہ تھا وہ حکیم الامت کے خاص مباحث اور گذشتہ حوالوں سے واضح ہے، تمام احترام و عقیدت کے باوجود مولانا دریابادی نے محض کتاب الٰہی کی صحیح تفہیم و تفسیر کے مفسر تھانوی کے بیان القرآن پر بہت سے استدراکات کیے، مفسر مرشد کا کمال مرتبت یہ ہے کہ وہ جن استدراکات کو صحیح سمجھتے تھے، ان کو قبول کر لیتے اور طبع دوم میں ایسے مقامات کی اصلاح بھی کر دیتے تھے، خاکسار راقم نے ایک طویل و مفصل تحقیقی مقالے میں مرشد و مفسر کی وسعت قلبی اور مسترشد و طالب کی علمی و اسلامی بصیرت پر بحث کی ہے، اسی مقالے کے چند ابعاد و جہات اور مباحث کا یہاں ایک سرسری جائزہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ بصیرت دریابادی کا یہ پہلو بھی روشن ہو جائے۔ (''حضرت تھانوی کی نادر صفت خود احتسابی - بیان القرآن پر استدراکات کے حوالے سے''، سہ ماہی حسن تدبیر دہلی، مئی - اکتوبر ۲۰۰۷ء، ۱۲۷، ۱۷۶)

استدراکات دریابادی کو مختلف عناوین کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے، ان میں سے ایک ترجمہ تھانوی میں بعض الفاظ قرآن کا ترجمہ ساقط ہو گیا ہے جیسے بیان القرآن ۱/ ۱۶۱: پر ''الی اجله''، ۱/ ۱۵۱ پر ''من ربکم''، ۱/ ۵۸ پر ''خٰلدین فهیا'' کا ترجمہ رہ گیا تھا، مزید حوالے بھی ہیں۔

بعض الفاظ و تراکیب قرآنی کا ترجمہ تھانوی نظم قرآن کے خلاف تھا جیسے ۱/ ۱۶۱، سورۂ بقرہ آیات - ۱۰۵، ۲۳۵، ۲۳۶؛ آل عمران - ۱۵۲ وغیرہ۔

متعدد تراجم کے ساتھ تفسیری اقوال تھانوی پر استدراکات جیسے سورۂ انعام: ۱۶۵ - ۱۶۶ وغیرہ۔

اختلافات قرأت کی توجیہ سے متعلق استدراکات دریابادی جیسے سورۂ فتح: ''بما عاهد علیه الله'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر وغیرہ۔

تفسیر بیان القرآن پر نقد و نظر دریابادی جیسے سورۂ بقرہ: ۹۱، آل عمران: ۱۲۱ - ۱۲۲۔

مرشد و مفسر تھانوی کی قبولیت اقوال مفسرین پر نقد و اصلاح جیسے کہف: ۱۶؛ بقرہ: ۱۷۷، انبیاء: ۹۶، یوسف: ۵۵، ۶۷ وغیرہ؟ سورہ بقرہ: ۲۶۰، مائدہ ۲۰، ۶۰، سورۂ یوسف: ۴۹ میں مستشرقین پر بھی نقد کیا ہے۔

بعض اہم قرآنی مباحث جیسے ختم نبوت، تورات و انجیل کی قرآن مجید کی لفظی تنزیل، قرآنی لفظ تنزیل و انزال و اتیان کا فرق، حضرت عزیر کی ابنیت وغیرہ، عزیز کے اصل مصری نام قطفیر، روح القدس سے اسلامی اور یہودی مراد، سدذوالقرنین، متعدد مباحث ہیں۔

مولانا دریابادی کا کارنامہ یہ ہے کہ تمام عقیدت و محبت کے باوجود اپنے مرشد مفسر کی تفسیر کا تنقیدی نظر سے بغور مطالعہ کیا، اس کے ''اسقام'' پر اعتراض و استدراک کیا اور کتاب و سنت اور علم و فن سے مطابقت چاہی اور محض اکابر پرستی میں سب کچھ قبول نہیں کیا، دوسری طرف مرشد و مفسر کا کارنامہ ہے کہ ایک خورد و مسترشد کی تمام باتوں کو محبت سے انگیز کیا اور جہاں مناسب سمجھا اپنی اصلاح بھی کر لی۔

ثانوی جدید تحقیقات سے استفادہ: بیشتر قدیم و جدید مفسرین بالعموم اور اردو مترجمین وشارحین بالخصوص قدیم مراجع اور روایتی مصادر کے غواص تھے مگر ان کو جدید تحقیقات و اکتشافات اور معاصر ثانوی مراجع و مآخذ کا اتنا پتہ تھا نہ ان کا درک، وہ ان کے ماہر ہونے کے مدعی بھی نہ تھے، ہر زمانے کے جدید اہل علم اور جامعات کے تعلیم یافتہ بالخصوص سائنسی مزاج کے حاملین ان روایتی تفسیروں میں اپنے سوالات کے جوابات نہیں پاتے، اسی طرح وہ کتب سابقہ کے بیانات وآیات سے استشہاد و استدلال یا ان کی تنقیح و تردید کے بھی قدرتی طور سے طالب ہوئے ہیں، بعض معاصر مترجمین وشارحین نے قرآنی تشریح و تعبیر میں اس زاویہ کا خیال رکھا ہے مگر وہ تردیدی زیادہ ہے اور تصدیقی، تحقیقی و تقابلی ہرگز نہیں ہے، مولانا دریابادی کی تفسیر ماجدی میں اس کا بہت اہتمام نظر آتا ہے، وہ کتب سماویہ سابقہ، جدید تحقیقات، اثری اکتشافات اور تقابلی مطالعات کا جس قدر خیال کرتے ہیں وہ دوسروں کے ہاں مفقود ہے، اس سے تفسیر ماجدی کو ایک بصیرتی فوقیت ملتی ہے، اپنے شیخ مفسر تھانوی کے حواشی اور فوائد بیان القرآن پر بھی اس زاویہ سے بہت سے استدراکات کیے تھے جو قبول بھی کیے گئے، عزیز مصر، ابنیت عزیر، روح القدس سے اسلامی اور یہودی مرادوں

کا فرق وغیرہ مباحث قرآنی کا ایک مختصر حوالہ اوپر آچکا ہے۔

سورۂ بقرہ-۶۱: ''...... لن نصبر علی طعام واحد ''الخ کی تفسیر میں بالعموم مفسرین نے پیروان حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نکیر کی ہے کہ وہ ''خیر طعام'' کے بالمقابل ''ادنی طعام'' کا مطالبہ کر کے نعمت الٰہی کا کفران کر رہے تھے، دریابادی نے انسائیکلو پیڈیا ببلیکا اور جیوش انسائیکلو پیڈیا کے حوالے سے اضافہ کیا تھا کہ وہ اپنے مرغوب کھانوں کا مطالبہ کر رہے تھے جن کے خوگر وہ مصر میں رہ چکے تھے کہ ان کی اصل غذا زمینی پیداوار تھی۔ (۱/ ۱۴۴ و مابعد)

اسی آیت کریمہ سے متعلق حاشیہ ۲۵ میں ہے ''اسرائیلوں کے مسلسل تمرد، سرکشی، نافرمانی کے تذکروں سے توریت وانجیل دونوں کے صفحات لبریز ہیں''۔ (۱/ ۱۴۸، بحوالہ تواریخ، یرمیاہ، نحمیاہ، متی، لوقا کے چند اقتباسات)

سورۂ بقرہ- ۶۲: میں وارد لفظ ''النصاریٰ'' کی تحقیق کی ہے کہ وہ موحد نصرانی اور سچے پیروان حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے، مسیحی مراد نہیں (۱/ ۱۵۰)، اسی طرح صابی/صابیون کی تحقیق جدید تواریخ واکتشافات سے کی ہے۔ (۱/ ۱۵۱- ۱۵۲: تورات وانجیل وغیرہ سے استناد اور ان کے اقتباسات ان گنت ہیں)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں دریابادی تحقیق تمام اسلامی مراجع ومصادر کے علاوہ اسرائیلی اور جدید تحقیقات پر مبنی ہے (۱/ ۲۳۶؛ اسی طرح دوسری ابراہیمی شخصیات و ذریات اور ان کے پیش روانبیاء واقوام کے متعلق ان کی تحقیقات جامع ہیں، مثلاً بنو اسرائیل کے بارہ چشموں پر تحقیق)۔

مصر کے مدارالمہام کا لقب عربی میں عزیز ہے جو مصری لفظ قطفیر کا عربی روپ ہے اور مرادف......۔ (۲/ ۵۸۸ و مابعد حکیم الامت، ۵۹۵)

روح القدس سے مسلم علما حضرت جبریل علیہ السلام کو مراد لیتے ہیں جب کہ عیسائی فکر میں وہ ایک بالکل الگ ہستی ہیں۔ (حکیم الامت، ۴۶۶؛ نیز سورہ بقرہ-۸۷، ۱/ ۱۵۳ حاشیہ بر روح القدس، ۱/ ۹۸ حاشیہ ۲۳۷)

رسول اکرم ﷺ اور قرآن مجید کے بارے میں قرآنی بیانات کی تصدیق وتائید کے

لیے مولانا دریابادی نے کتب سابقہ، اثری تاریخی اکتشافات اور جدید تحقیقات کا ایک انبار عظیم لگا دیا ہے جو ان کے غایت و گیرائی مطالعہ کا شاہد تو ہے ہی، جدید ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے والا ہے، چند مثالیں: سورۂ آل عمران – ۱۲۱، ۱۲۲: مقاعد للقتال میں بیسویں صدی کے ایک فرنگی مورخ Tom Andre اور مولانا شبلی نعمانیؒ کا حوالہ دے کر تحسین کی ہے۔ (۱/ ۶۲۶؛ ۲/ ۱۷۱-۲۷۲ بحوالہ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ؛ ۲/ ۱۹۴ و مابعد ایضاً؛ ۲/ ۲۲۸، رشید رضا)

تنقیدی تجزیہ: قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر اور حاشیہ و تعبیر کی دو سطحیں ہیں: ایک عام قاری اور طالب حق کے لیے جن کی اکثریت ہے، دوسری فنی ماہرین، تفسیری متخصصین اور علما و اہل دانش و بینش کے لیے جن کی ہر قوم میں تھوڑی تعداد ہوتی ہے اور جو وسعت بیان کے خوگر ہیں، مولانا دریابادی نے اپنے تفسیری تجزیہ میں ان دونوں کا فرق و امتیاز نہیں کیا اور اسی بنا پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فتح الرحمٰن اور ان کے فرزند گرامی شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے موضح القرآن کا خاص امتیاز نہیں جانا، وہ بہ قول شاہ بزرگ مسلم امت کے تمام عوام کی قرآنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہیں، البتہ خواص اور علما بھی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں کہ ان کے خاص ذوق کی بھی ان میں خاص رعایت کی گئی ہے اور یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، عربی میں طبری، رازی، قرطبی وغیرہ اور اردو میں تھانوی اور خود دریابادی وغیرہ سے استفادہ صرف اہل علم کا بلند تر طبقہ کر سکتا ہے، عوام کے طبقات نہیں کر سکتے، مولانا دریابادی کو بھی اعتراف ہے کہ قرآن مجید تمام اقوام عالم کے تمام طبقات کے لیے ہے، ان میں عوام کے طبقات صرف قرآن منطوق کی مختصر تشریح سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو بہ قول شاہ بزرگ لا طائل تفصیلات، طویل تفسیری مباحث، پیچیدہ علمی دقائق اور بلند فنی نکات سے ہرگز مستفید نہیں ہو سکتے، مسلم اور غیر مسلم دونوں کی اکثریت کے لیے کتاب ہدایت کے معانی کے سادہ و سہل اور ان کی مروج زبان میں ترجمے اور ضروری حواشی ہی کافی ہیں۔

تفسیر دریابادی کا شمار اور ان کی اصل اصیل تفسیر تھانوی اور دوسری عظیم ترین تفسیروں کی گنتی صرف اہل علم و فن کے لیے ہے، اس اقلیتی طبقہ اور فنی دائرہ کے لیے موجودہ دور میں اردو میں تفسیر دریابادی بلاشبہ بلند ترین مقام و مرتبت کی حامل ہے کہ اس کا کوئی دوسرا مقابل نہیں، مولانا دریابادی نے اپنی تفسیر میں جن اہم جہات و ابعاد کا خاص خیال رکھا ہے اور جن کی وجہ سے

اس کی عالی مرتبی قائم ہوتی ہے بہ شکل نکات حسب ذیل ہیں:

قرآنی نظم اور محاورۂ قرآنی کے مطابق مولانا دریابادی نے الفاظ وکلمات اور آیات و تعبیرات کا ترجمہ بہتر سے بہتر کیا ہے۔

عربی قرآن کریم کے اردو ترجمہ کی مشکلات اور ان کو دور کرنے کے بعض قواعد واصول بھی اپنے دوافتتاحیوں میں مختصراً بیان کیے ہیں۔

ان قواعد واصول ترجمہ کے مطابق انہوں نے اپنے ترجمہ میں نظم قرآنی کا خیال کیا ہے، یہ قواعد واصول کا اطلاق بھی ہے جو بہت مشکل ہے۔

غالباً اردو میں اور عربی میں بھی کسی قدر دریابادی کے سوا کسی اور نے قدیم قرآنی مصادر و مراجع سے اتنا استفادہ نہیں کیا۔

اس بسیط وعریض استفادہ کے ساتھ ساتھ مولانا دریابادی نے اپنی تشرحات وحواشی میں تمام اہم مراجع کا عطر بھی جمع کر دیا ہے۔

جدید علمی تحقیقات سے استفادہ دریابادی وسیع ترین اور ہمہ گیر ہے، ان میں مشرقی اور مغربی دونوں ماہرین کے افکار موجود ہیں۔

ان تحقیقات جدیدہ اور افکار استشراق کے بارے میں دریابادی طریقہ صرف نقد و استرداد کا نہیں ہے بلکہ صحیح کو قبول کرنے کا بھی ہے۔

کتب سماویہ سابقہ - تورات وانجیل وغیرہ سے بھی استفادۂ دریابادی اسی طرح دوگونہ ہے: تائیدی بھی اور تنقیدی بھی۔

ترجمہ وتفسیر دونوں میں دریابادی نقطۂ نظر خالص علمی نقد اور اسلامی تنقید کے اصول پر مبنی ہے کہ کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

قدیم سے استفادہ، پیش رووں سے استناد اور گذشتہ سے پیوستہ میں بھی وہ بالعموم تقلید اکابر سے احتراز کرتے ہیں۔

مولانا دریابادی صاحب طرز اردو ادیب تھے، ان کا ایک خاص اسلوب ہے جو کسی اور مترجم ومفسر کے پاس نہیں ہے، لہذا ان کے ترجمہ میں بھی اور تفسیری حواشی میں بھی دریابادی اسلوب

رواں دواں نظر آتا ہے اور صاحبان نظر ایک ہی نظر میں اسے دونوں جگہ پہچان لیتے ہیں۔

بایں ہمہ جس طرح مولانا موصوف نے معصومیت اکابر سے انکار اور اپنی غلطیوں کا اقرار کیا ہے، تفسیر ماجدی بھی اسی طرح نقد ونظر کا ہدف بن سکتی ہے اور بن جاتی ہے، کیوں کہ وہ بہر حال ایک بشری تعبیر وتشریح کی کوشش ہی ہے، چاہے جتنی بلیغ ہو لغزشوں سے مبرا نہیں۔

تمام قدیم وجدید اردو عربی مفسرین پر ہر زمانے میں نقد ہوا ہے، جامعین میں طبری، رازی، قرطبی، تھانوی اور آلوسی بھی اس سے نہ بچ سکے، مولانا دریابادی کا تجزیۂ اکابر تمام جہات کو حاوی نہیں، بالخصوص تھانوی اور آلوسی میں سب کچھ ہونے کا دعویٰ تجزیہ سے زیادہ مدلل مداحی پر مبنی ہے، آلوسی نے جس طرح آیات وتعبیرات قرآنی کو صوفی تعبیرات کے ماتحت کیا ہے وہی ان کی قرآنی وتفسیری حیثیت کو مجروح اور ناقابل اعتبار ٹھہراتا ہے، تھانوی کو بھی آلوسی اسی باب تصوف کی بنا پر بہت پسند تھے، اگرچہ انہوں نے آلوسی کی مانند کلام اللہ کو کلام صوفیہ کے ماتحت نہیں کیا ہے، متعدد مقامات پر ان کی صوفیانہ تشریحات ونکات آیات والفاظ قرآنی کہ تہہ در تہہ جہات ومعانی کی گرہیں کھولتی ہیں مگر وہ خالص صوفیانہ بھی نہیں، اکابر مفسرین وشارحین کی تفسیری تعبیرات کا سراغ ہی نہیں، ان کا ثبوت ملتا ہے، پھر یہ صوفیانہ تشریحات محض لطائف وظرائف ہیں، مرشد تھانوی اور مشائخ محققین کے بہت سے اقوال وتاویلات اور تعبیرات کتاب وسنت پر مبنی ہیں لیکن ان کا حوالہ دینے کے بجائے صرف صوفیہ کا حوالہ دینا عجیب لگتا ہے، مولانا دریابادی نے جامعیت کا تصور بہت وسیع سمجھ لیا، وہ صحیح اس وقت ہوسکتا ہے جب ہر رطب ویابس بلکہ صحیح و مہمل پر مبنی نہ ہو۔

ترجمہ میں بلاشبہ دریابادی نے بالعموم نظم قرآنی کی رعایت کا اہتمام اپنے علم وفہم اور اپنی بساط ترجمانی تک ضرور کیا ہے، مگر وہ بہت سی چیزوں میں اور بہت سے مقامات پر دوسروں کا ترجمہ قبول کر لیتے ہیں اور اس سے متاثر ہوجاتے ہیں حالاں کہ وہ لفظ قرآنی کے خلاف ہے، مثلاً قرآن کریم کی آیت بقرہ ہر جگہ گائے کے معنی میں ہے مگر محض مفسر تھانوی کے زیر اثر اسے گائے بیل دونوں کے معنوں میں مشترک سمجھ لیا ہے، مولانا تھانوی کا اگلی آیت سے استدلال بالکل صحیح نہیں ہے، قرآن مجید کے الفاظ اور ان کی خاص کی اصطلاحات جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ، ربا، صدقہ،

حج ،نسک وغیرہ کے مخصوص معانی ہیں اور وہ ہر جگہ یکساں ہی ہیں، وہ ان الفاظ قرآنی میں نہیں ہیں جو مختلف مقامات واحوال پر مختلف معانی ومفاہیم کے لیے لائے گئے ہیں، جیسے دین، امت، ملت ،حق وغیرہ ،حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ کو پوجا پاٹ وغیرہ سے تعبیر کرنا یا حضرت یوسف علیہ السلام کو فرشتہ قرار دیے جانے سے متعلق تعبیرات دریابادی ان کے ایسے افکار ومعلومات پر مبنی ہیں، وہ قرآنی واضح و متعین تعبیر کے خلاف ہیں ۱۰/ ۴۴ - ۲۵)، صلوٰۃ تمام انبیائے کرام اور ان کے مومنوں کے ہاں تھی اور فرشتہ کا تخیل وتصور بھی مشرکوں میں تھا خود قرآن کریم ان کی تصویب وتصدیق کرتا ہے، وہ خواہ اہل کتاب سے آیا ہو یا قریش/عرب میں دین حنفی سے، بسملہ پر ان کی بحث صرف حنفی نقطہ نظر سے ہے اور امام سیوطیؒ کی روایتی رائے پر مبنی جس کے نتیجے میں وہ سورتوں اور بسملہ کے تعلق کو نہیں سمجھ سکے۔

بہ قول امام ابن تیمیہ قرآن مجید میں مترادفات نہیں ہیں ، ان کو زیادہ سے زیادہ متقاربات کہا جاسکتا ہے کہ وہ معانی کی اشباح رکھتے ہیں، قرآن کریم نے مثلاً گائے کے لیے بقرہ کا اور بیل کے لیے عجل کا لفظ استعمال کیا ہے، لہذا ان دونوں کے معانی کا فرق واضح ہے، وہ دونوں ایک نہیں ہوسکتے ، جیسے حمد اور شکر، صلوٰۃ ودعا، زکوٰۃ وصدقہ ، عائل وفقیر/عیلہ وفقر ان کی مانند بہت سے الفاظ ہیں جن کا ایک ترجمہ نہیں کیا جاسکتا کہ غلط ہوگا، یہ تسلیم کہ اردو زبان کی تنگ دامانی عربی کی وسعت کا سامنا نہیں کرسکتی جیسا کہ مولانا دریابادی نے تین تین/سات سات الفاظ وتعبیرات قرآنی کے بارے میں بجا طور سے کہا ہے لیکن جہاں اردو خزانے میں الفاظ موجود ہیں وہاں بازو سمٹ جائیں تو اسے صرف چند کلیوں پر قناعت ہی سے تعبیر کریں گے۔

قرأت/قراءات قرآنی کے باب میں مولانا دریابادی اپنے پیش روؤں میں سے کسی نہ کسی سے متاثر ومغلوب ہوگئے ہیں، اپنے شیخ مفسر ومحقق تھانوی کے قرأت کے مباحث میں ان کی اثر پذیری بہت واضح ہے، مولانا تھانوی قرأت کے باب میں روایتی مفسر تھے، رسم عثمانی کے علاوہ یا اس سے الگ الفاظ وتعبیرات اور کلمات کو وہ قرأت قرآن کی بوقلمونی سمجھتے رہے جب کہ رسم عثمانی کی کلی مطابقت فرض ہے، صحابہ کرام اور تابعین عظام نے الفاظ وکلمات قرآنی کے جو معانی اپنی زبان کے دوسرے غیر قرآنی الفاظ میں لکھ لیے وہ قرآنی قراءات نہیں ہیں۔

آیات وضو میں پیروں کے دھونے کے لیے ''ارجلکم'' لفظ قرآنی ہے، اس کو بعض نے مسح والے قریبی کلمہ سے وابستہ کرکے ''ل'' کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے، اس کو قرأت متواترہ کہنا شاید صحیح نہیں ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک پیروں کا دھونا لازمی ہے۔ (۱/ ۸۶۰-۸۶۳: خود مولانا دریابادیؒ نے لکھا ہے کہ دونوں پیروں کا دھونا ہی...... سنت رسولؐ سے بھی ثابت ہے اور تعامل صحابہ سے بھی......'' اختلافی آراء بھی دی ہیں، مگر دھونے کی قرأت و حکم دونوں کو جمہور کا مسلک بھی کہا ہے، لہذا مسح اور زیر کی قرأت متواتر کیوں کر ہوئی)

مولانا عظیم اردو ادیب تھے اور ایک طرز کے موجد بھی اور خاتم بھی تھے، ان کی صحت زبان و محاورہ ہر طبقہ اہل علم و ادب کے ہاں مسلم ہے، اس کے باوجود بعض جگہ ہم بے ادبوں کو مشکل الفاظ بلکہ ادق عربی محاورہ سے واسطہ پڑتا ہے اور تذکیر و تانیث میں بھی بسا اوقات خلجان ہوتا ہے، ''اسی طرح مشائخ محققین بعض دفعہ مباحات سے روک دیتے ہیں کہ کہیں غیر مباح کی طرف منجر'' نہ ہو جائے (۱/ ۱۰۷)، بہ قول ایک ادیب اردو میں پیش، زبر، زیر ہیں لیکن عربی زبان کے بارے ضمہ، فتحہ اور جر و کسر کہے بغیر نہیں مانتے اور اردو میں زیر کو ''خفض'' کہنا تو سراسر زیادتی ہے، ایسی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، تذکیر و تانیث کی ایک مثال سلویٰ کی تشریح میں ہے کہ ''ایک قسم کا بٹیر ہے'' (۱/ ۱۳۶)، اسے جانور بھی قرار دینا دلچسپ ہے کہ پرندہ کی طرح اڑتا ہے، یہ شاید ترجمہ کا اثر ہے۔

مولانا دریابادیؒ جیسے ماہر زبان و ادب جب ''بیسویں صدی کے ثلث آخر'' لکھیں تو کسی کو ابوالکلام آزاد کی معرب و مفرس اردو سے کیوں شکایت ہو (۱/ ۲۰) ''شیطان یعنی مغوی اول'' (۱/ ۲۷) جیسی تعبیر بھی اسی عربیت پرستی کی دین ہے، ایسے عربی مغلق وادق الفاظ کی ایک کثرت ہے، مولانا مرحوم کی بعض تعبیرات اور محاورے بھی طبع زاد ہوگئے ہیں، ہم کم علموں نے ''عمل دخل'' ہونا سنا تھا لیکن مولانا موصوف نے اسے عملہ دخلہ بنا دیا ۱۰/ ۳۰: ''جب سے سائنس اور علوم طبعی کا عملہ دخلہ پوری طرح شروع ہوگیا......'')، ان جیسی مثالوں میں کرامات کاتب و ناشر بھی ہوسکتی ہیں لیکن متن حواشی میں اور مقدمات میں قلم دریابادی ہی کی کارگزاریاں لگتی ہیں۔

انسانی خطاؤں اور لغزشوں سے تو کوئی بھی محفوظ نہیں وہ ترجمہ و تفسیر، تشریح و تعبیر اور

زبان و بیان ہر جگہ ہوسکتی ہیں، تفسیر ماجدی اپنی تمام تر بشری محدودیت کے باوجود اردو تفاسیر میں ہی نہیں جدید عربی تفاسیر میں بھی ایک مقام و مرتبہ اور امتیاز و اختصاص کی مالک ہے، وہ اہل علم و فن اور معاصر دانش وروں کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جامع فنی مباحث اور دقیق تفسیری نکات بھی ملتے ہیں، کسی بھی میدان علم وادب میں دو یا دو سے زیادہ مصنّفین و مولفین کا تقابلی موازنہ ہر جہت سے بالکل صحیح اور غیر جانب دارانہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہوتا ہے، ہر صاحب فن کی انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں کہ جہانِ بشر میں افضلیت کلی کسی بھی شخص اور شہ پارہ کو نہیں ہوتی، البتہ مجموعی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے تفسیر ماجدی اپنی تمام معاصر تفاسیر پر ایک خاص فوقیت رکھتی ہے۔

فارم IV

(رول نمبر ۸)

نام رسالہ: معارف، اعظم گڈھ

نام پریس: معارف پریس، اعظم گڈھ — نام پبلیشر: عبدالمنان ہلالی

مقام اشاعت: دارالمصنّفین، اعظم گڈھ — قومیت: ہندوستانی

وقفۂ اشاعت: ماہانہ — پتہ: دارالمصنّفین، اعظم گڈھ

نام پرنٹر: عبدالمنان ہلالی — اڈیٹر: اشتیاق احمد ظلّی

قومیت: ہندوستانی — قومیت: ہندوستانی

پتہ: دارالمصنّفین، اعظم گڈھ — پتہ: دارالمصنّفین، اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنّفین، اعظم گڈھ

میں عبدالمنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عبدالمنان ہلالی

شام کے ادیب و محقق خلیل مردم بک
(۱۸۹۵-۱۹۵۹)

پروفیسر محمد راشد ندوی

۱۹۵۳ء میں شام کے مشہور ادیب اور وہاں کے سپریم کورٹ کے جج علی طنطاوی ہندوستان تشریف لائے، مسئلہ فلسطین کی وضاحت کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کا جانا ہوا، اس سلسلہ میں لکھنؤ بھی تشریف لائے، لکھنؤ آنے کا مقصد جہاں مسئلہ فلسطین کی وضاحت تھی وہیں اس میں دارالعلوم ندوۃ العلما اور استاذ محترم سید ابوالحسن علی ندوی کی کشش بھی شامل تھی، جب وہ لکھنؤ تشریف لے آئے تو شہر میں جلسہ عام ہوا جس میں انہوں نے پرجوش تقریر کی جس کا اثر عوام وخواص دونوں پر یکساں پڑا، لکھنؤ کے دوران قیام ان کے کئی لکچر دارالعلوم میں بھی ہوئے، دارالعلوم میں جو لکچر ہوئے ان کا زیادہ تر موضوع علمی وادبی تھا اور ان کا تعلق ان کی مہم سے بالکل نہیں تھا، زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ایک عرب ادیب اور خطیب کی زبان سے عربی زبان کو سنا، لکچر سننے کے بعد جو میرے اندر کیفیت پیدا ہوئی اس کو بیان نہیں کرسکتا، علی طنطاوی عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور مصنف تھے، ان کی زبان میں جو حلاوت اور کشش تھی اس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا اور اس کے نقوش آج تک دل ودماغ پر باقی ہیں، شام کے ادیبوں کے سلسلہ میں میری معلومات بالکل نہیں تھیں، کیوں کہ ہندوستان میں زیادہ تر مصری ادیبوں کا بول بالا تھا اور ہندوستان کے علما وادبا عموماً ان ہی سے واقف تھے، علی طنطاوی کے خطبوں نے میرے دل میں ایک خواہش پیدا کی کہ کاش شام جانے کا موقع مل جاتا تو وہاں عربی

علی گڑھ۔

زبان سیکھنے کے اچھے مواقع نصیب ہوجاتے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب عرب ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ذرائع ووسائل بہت ہی محدود تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے، لیکن صحیفۂ غیب میں کیا لکھا رہتا ہے انسان کو نہیں معلوم ''لا تدری نفس ماذا أخفیت لها من قرة أعین ''۔

چنانچہ ۱۹۵۵ء میں استاذ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مجھ سے فرمایا کہ تم کو خوش خبری دیتا ہوں کہ شام کے سفر کا غیبی انتظام ہوگیا ہے، حکومت شام نے دمشق یونی ورسٹی میں اعلا تعلیم کے لیے تین اسکالرشپ دارالعلوم ندوۃ العلما کو دیے ہیں اور انتخاب کی ذمہ داری میرے سپرد کی ہے، اس خبر نے میرے اعصاب کو ہلا دیا، مسرت کے ان لمحات کو میں اپنی زندگی کے سب سے قیمتی لمحات سمجھتا ہوں، چنانچہ ۱۹۵۵ء کے آخر میں شام کے سفر کی تیاری شروع ہوگئی، ڈاکٹر سید رضوان علی، ڈاکٹر سید اجتباء ندوی اور راقم الحروف کا انتخاب ہوا، میں اور ڈاکٹر رضوان علی ساتھ دمشق پہنچے اور کچھ عرصہ کے بعد سید اجتباء ندوی بھی تشریف لائے، دمشق پہنچنے کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ ہم کسی نئے شہر میں نہیں آئے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اس شہر سے پوری واقفیت ہے اور واقفیت کے ساتھ انس بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مصر وشام تشریف لے گئے تھے اور مصر وشام کے ادیبوں، مصنفوں اور خاص طور سے اسلام پسند نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئے تھے، مولانا کی وجہ سے وہاں کے لوگوں نے ہم لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ہم اپنی فیملی اور خاندان کے ساتھ رہ رہے ہیں، شام کی سرزمین سے تھوڑی واقفیت جو تھی اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے ذریعہ تھی، ذہن کے ہر گوشے میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ پہلی صدی ہجری ہی میں شام نے اپنا رعب ودبدبہ پوری دنیا پر قائم کر رکھا تھا، مدینہ منورہ سے خلافت یا حکومت دمشق پہنچ چکی تھی اور دمشق سے حضرت معاویہؓ اور بعد میں بنوامیہ کے خلفاء نے اسلامی جھنڈے کو مغرب میں، شمالی افریقہ اور بعد میں اندلس تک لہرادیا تھا، مشرق میں ہندوستان کے اندر ملتان تک کا علاقہ ان کی جولان گاہ بنا ہوا تھا، ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت قائم ہوچکی تھی جس کی مثال انسانی تاریخ میں کم ملتی ہے، یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس شہر میں جو بہت عرصہ تک سیاست وحکومت اور زبان وبیان کا مرکز و

گہوارہ رہا تھا، تعلیم حاصل کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔

دمشق میں قیام کے چند دن گزرے تھے کہ وہاں یہ خوش خبری سنائی گئی کہ حکومت شام نے استاذ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دو ماہ کے لیے الاستاذ الزائر (وزیٹنگ پروفیسر) کی حیثیت سے مدعو کیا ہے اور مولانا نے اس دعوت کو قبول کرلیا ہے، جس دن سے یہ خوش خبری ہمیں سنائی گئی اسی دن سے مولانا کی آمد کے منتظر تھے اور دل بے چین رہتا تھا، خدا کا شکر ہے کہ جن تاریخوں میں مولانا کو شام پہنچنا تھا، ان ہی تاریخوں میں مولانا دمشق پہنچے، وہاں مولانا کے استقبال کے لیے دمشق یونی ورسٹی کے اساتذہ، شام کے مشہور ادباء و مصنّفین اور نوجوانوں کا بہت بڑا طبقہ تیار تھا اور مولانا کا جس انداز سے استقبال کیا گیا وہ یادگار بن گیا، حضرت مولانا کی مدت قیام دو ماہ تھی، مولانا جہاں بھی جاتے تقریباً ہم تینوں ان کے ساتھ رہتے، اس طرح مولانا کی وساطت سے شام کے ادیبوں اور مصنفوں سے بڑی حد تک تعارف کا موقع ملا اور وقتاً فوقتاً ان سے ملنے کی سعادت اور زبان سیکھنے کے مواقع کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے اصول و مآخذ سے واقفیت بھی حاصل ہوتی رہتی، مولانا کے اسی سفر میں ہماری ملاقات شام کے مشہور ادیب و شاعر خلیل مردم سے ہوئی اور یہ زمانہ ۱۹۵۶ء کا تھا، پہلی ملاقات خلیل مردم سے مولانا کے ساتھ المجمع العلمی العربی کی عمارت میں ہوئی، خلیل مردم اس وقت المجمع کے صدر (رئیس) تھے، المجمع کے صدر کا دفتر، اعلا درجہ کے فرنیچر اور قالین سے مزین اور قابل دید تھا، خلیل مردم کو دیکھتے ہی آنکھیں چمک گئیں، ان کی موہنی صورت، گول چہرہ، سر پر گھنے بال، چوڑی پیشانی، آنکھوں میں چمک جس سے ذہانت مترشح ہو رہی تھی، زبان میں حلاوت اور گفتگو میں ایسی سنجیدگی کہ ہر ہر لفظ زبان و بیان کی لطافتوں میں ڈوبا ہوا تھا، وہ مسلسل آنے والوں کا جس انداز میں خیر مقدم کر رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ خاندان کے کسی بچھڑے ہوئے فرد کا استقبال ہو رہا ہے، اس ملاقات میں حضرت مولانا کم بول رہے تھے زیادہ تر خلیل مردم ہی مختلف انداز میں اپنی محبت و اخلاص کا اظہار فرما رہے تھے، اسی ملاقات میں ایک دن انہوں نے کھانے پر مولانا کو مدعو کیا اور بہت ہی محبت کے انداز سے فرمایا کہ آپ ہماری دعوت قبول کرلیں تو ہمیں خوشی کے ساتھ ساتھ فخر بھی ہوگا کہ ہندوستان کے ایک عالم کے ساتھ کھانے کا موقع ملا، حضرت مولانا نے دعوت قبول فرمالی، معینہ

وقت پر دعوت کے لیے مولانا کے ساتھ ہم لوگ بھی المجمع کی عمارت میں پہنچے، جہاں خلیل مردم کی طرف سے کئی لوگ متعین کر دیے گئے تھے کہ وہ ہم لوگوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچائیں، خلیل مردم کا مکان دفتر کے قریب تھا، عمارت باہر سے قلعہ لگ رہی تھی، جب اندر پہنچے تو بہت وسیع صحن تھا، صحن کے چاروں طرف سنترہ کے درخت لگے ہوئے تھے اور بیچ میں فوارہ تھا، پورا صحن سنگ مرمر سے بنا ہوا تھا، صحن ہی میں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا، تعداد بتانا مشکل ہے کہ کتنے لوگ مدعو تھے لیکن اتنا تو یاد ہے کہ حاضرین میں دمشق یونی ورسٹی کے اساتذہ، المجمع کے تمام ممبران، دمشق کے ادبا و شعرا اور دمشق میں عرب ملکوں کے سفرا مدعو تھے، ایسا حسین مجمع بلکہ یوں کہیں کہ علما، ادبا، شعرا اور مصنّفین کے ایسے حسین گلدستہ کے نقوش کبھی ذہن سے ختم نہ ہونے پائیں گے۔

خلیل مردم سے دوسری ملاقات ۱۹۵۷ء میں علامہ عبدالعزیز میمنی کی معیت میں ہوئی، علامہ کو شام کی وزارت تعلیم نے مخطوطات کے سلسلہ میں مشورے اور کچھ لکچرس دینے کے لیے مدعو کیا تھا، علامہ کا یہ خاص موضوع تھا اس لیے وہ خوشی سے کراچی سے دمشق تشریف لائے، علامہ میمنی سے چند دن پہلے دمشق میں میری ملاقات ہو چکی تھی اور ان کے ساتھ بعض جگہوں پر جانے کا موقع ملا تھا، علامہ جب دمشق تشریف لائے تو ہماری قیام گاہ کے قریب ایک ہوٹل میں قیام فرمایا جہاں دمشق کے علما و مصنّفین اور وزارت تعلیم کے اعلا درجہ کی شخصیات ان سے ملنے آئیں، علامہ کے ساتھ جب ہم خلیل مردم سے ملنے گئے تو جس تپاک سے وہ ہم سے ملے ایسا لگ رہا تھا کہ چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی سے مل رہا ہے، مسرت و محبت ان کی پیشانی سے چمک رہی تھی گویا وہ زبان قال سے نہیں زبان حال سے بڑے بھائی کا استقبال کر رہے ہیں، جس کو المجمع اور اس کے تمام ممبران سے محبت اور لگاؤ ہے، میمنی صاحب خلیل مردم کے آفس میں بیٹھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ ایک اعلا درجہ کا معلم اپنے کسی شاگرد کے پاس آیا ہو، اس وقت خلیل مردم بہت کم بول رہے تھے، زیادہ تر علامہ میمنی صاحب مختلف موضوعات پر بولتے رہے اور جب کبھی کسی نادر کتاب یا مخطوطہ کا ذکر ہوتا تو بے ساختہ قہقہہ لگاتے اور کتاب پر تبصرہ شروع کر دیتے، میمنی صاحب کا یہی انداز تھا، بڑے سے بڑے ادیب اور محقق کے ساتھ بھی ان کا قد ہمیشہ اونچا ہی نظر آتا، خلیل مردم نے میمنی صاحب کو بھی کھانے پر مدعو کیا اور اس وقت بھی ان کی دعوت کا وہی انداز

تھا جو عرب علما و رؤسا کا ہوتا ہے، کھانے پر شام کے ادیبوں، مصنفوں اور عرب سفرا کا اجتماع تھا، میمنی صاحب اپنے مخصوص انداز میں لوگوں سے بولتے، مسکراتے ہوئے علم واخلاق کے پھول بکھیرتے رہے، کھانے سے زیادہ اہم ان کے نزدیک اعلا پایہ کی شخصیات کا اجتماع تھا، جہاں وہ بڑی سادگی سے علمی تبادلہ خیال میں منہمک تھے، واقعۃً عالم کا ایک وقار ہوتا ہے اور اگر وہ اپنے وقار کو باقی و برقرار رکھے تو بڑی سے بڑی شخصیت اس کے سامنے جھک جاتی ہے، مسئلہ صرف اپنے وقار کو باقی و برقرار رکھنے کا ہے، وہ اپنی درویشی میں بھی شاہانہ انداز رکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر علم کا اعلا مقام کسی کو نصیب ہوجائے تو بادشاہوں کی بادشاہت بھی اس کے سامنے ہیچ ہے، بہرصورت مجھے خلیل مردم سے ہندوستان کی دو اہم شخصیتوں کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا جس کو میں بھول نہیں سکتا اور بلاد عربیہ کے سفر میں حاصل ہونے والی سب سے عزیز متاع تصور کرتا ہوں، اس موقع پر مجھے عقاد کا یہ شعر یاد آتا ہے:

وأبيع حظى فى الحياة بساعة أنسى بها عمرى كأن لم أولد

خلیل مردم کی شخصیت ان دو ملاقاتوں میں پوری طرح میری نظر میں سما گئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ انسان ایک اعلا خاندان کا فرد ہے جو اپنے وقار، سنجیدگی اور علم وفن کی یہ دولت اپنے خاندان کے ماضی کی عظمت کو صرف باقی ہی نہیں بلکہ اس کو بہتر سے بہتر کر رہا ہے۔

خلیل مردم ۱۸۹۵ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، خاندانی اعتبار سے دمشق کے ہر حلقہ میں بہت ہی معزز اور موقر تھے، باپ اور ماں دونوں کے خاندان احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کے نانا بھی دمشق کے مشہور عالم تھے، ان کی اور دوسرے بزرگوں کی تعلیم وتربیت کی وجہ سے سنجیدگی، وقار، دوسروں کا احترام واکرام، وفاداری اور محبت کی خوبیاں ان میں بہ درجۂ اتم تھیں، وہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے شام اور فلسطین دونوں دولت عثمانیہ کے زیر سایہ تھے، دولت عثمانیہ کے اندر انتشار وخلفشار کی شروعات ہوچکی تھی اور خود دولت عثمانیہ کے وہ علاقے جہاں کی زبان ترکی تھی، وہاں بھی عام بے یقینی کا عالم تھا، حکومت کا سیاسی وسماجی ڈھانچہ کمزور سے کمزور تر ہو چکا تھا اور وہ عرب ممالک جو دولت عثمانیہ کے زیر سایہ تھے، وہاں کی اپنی زبان عربی تھی لیکن عربی زبان کے فروغ اور اس کی تعلیم کے لیے کہیں بھی باقاعدہ انتظام نہیں تھا، سرکاری مدارس بہت ہی خستہ حالت

میں تھے اور وہاں بھی ذریعہ تعلیم ترکی زبان تھی، سرکاری اسکولوں کے علاوہ جو دینی مدارس تھے جن کی سرپرستی عوام کرتے تھے وہاں کا بھی نظام تعلیم کے تقاضوں کے مطابق نہیں تھا، ایسے دور میں خلیل مردم پیدا ہوئے، ان کے والد نے اس وقت کے ایک عام اسکول میں انہیں داخل کردیا، جو مضامین اس زمانہ میں اسکولوں میں پڑھائے جاتے تھے ان کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے ان مضامین کو داخل نصاب کردیا گیا ہو، خلیل مردم کی تعلیم کا یہ سلسلہ جاری رہا، جب ان کی عمر ۱۵/سال کی ہوئی تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا، بیٹوں کے اکلوتے بھائی خلیل مردم سب سے چھوٹے تھے، باپ کے انتقال کے بعد بہ ظاہر کوئی سہارا نہیں تھا، ۵/سال بعد والدہ کا بھی انتقال ہوگیا، یہ وقت خلیل مردم کی زندگی کا سب سے پیچیدہ اور مشکل دور تھا، اگرچہ والد نے کافی مال و دولت ترکہ میں چھوڑا تھا، جس کی وجہ سے معاشی پریشانی نہیں تھی لیکن تنہائی کا احساس ان کو اندر سے بے چین رکھتا تھا، اس کا اظہار ان کی کئی نظموں میں ہوا۔

خلیل مردم کی ابتدائی زندگی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب سے کافی دل چسپی تھی، چنانچہ ۱۵/سال کی عمر کے بعد ہی انہوں نے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا اور یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخر تک جاری رہا، شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے عربی زبان و ادب کے مختلف مراحل کا بھی بڑے انہماک اور لگن سے مطالعہ کیا اور ہر دور کی اعلا اور ممتاز شخصیتوں کے فکر و فن کا مطالعہ کیا، اس طرح شاعری اور نثر نگاری دونوں میں اپنے آپ کو اس دور کے ممتاز ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کی صف میں شامل کردیا، اس زمانہ میں زیادہ تر علما کسی ایک فن میں ماہر ہوا کرتے تھے، کوئی نحو و صرف کا کوئی فن بلاغت کا ماہر، کوئی قدیم شاعری کی تعلیم و تدریس میں ممتاز، کسی کو فقہ میں اختصاص اور علم کے پروانے ان سے فائدہ اٹھاتے، خلیل مردم کے دور میں جنہوں نے شام میں شہرت حاصل کی ان میں شکیب ارسلان، رشید رضا اور طاہر جزائری شامل ہیں، یہ جامع کمالات تھے اور ان ہی لوگوں میں کرد علی کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنی محنت، کاوش اور صلاحیت سے شام ہی میں نہیں بلکہ تمام عرب ممالک میں اپنے علمی، ادبی اور تاریخی وقار کو بڑھایا اور بڑی شہرت و عزت حاصل کی، خلیل مردم نے کرد علی کے نقش قدم پر چل کر زندگی کے مختلف

شعبوں میں آگے بڑھنے کی ہمت کی اور اپنی محنت کی بہ دولت، بعد میں وہ صحیح معنی میں کرد علی کے جانشین ثابت ہوئے۔

کرد علی عربی زبان و ادب کے محقق، مورخ اور جدید علمی و ادبی تحریک کے بانی قرار دیے جاسکتے ہیں، خلیل مردم کی اسلامی تاریخ پر نظر تھی لیکن کرد علی کے مقابلہ میں تاریخ پر ان کا مطالعہ اتنا گہرا نہیں تھا لیکن جہاں تک عربی زبان و ادب کا تعلق ہے خاص طور سے عربی کے قدیم نصوص چاہے وہ نثر سے تعلق رکھتے ہوں یا نظم سے، وہ ان کے دائرۂ مطالعہ میں رہے اور قدیم عربی نصوص کی تنقید و تنقیح اور قدیم عربی شخصیات کے سلسلے میں ان کی تحریریں آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ بن گئیں، اس کے علاوہ انہوں نے جدید ادب کا مطالعہ جدید اصولوں کے تحت کیا، شعر، نثر اور عالمی ادب و تنقید کے تعلق سے بلند پایہ کتابوں کا انہوں نے دل چسپی مطالعہ کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان و ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا، انہوں نے انگلستان کا سفر بھی کیا اور ۳/سال لندن میں رہ کر انگریزی زبان میں قابلیت پیدا کی اور وہاں سے اعلا ڈگری حاصل کی، خلیل مردم شام کے ادیبوں میں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انہیں انگریزی زبان و ادب پر اعلا درجہ کا ملکہ حاصل تھا اور اسی لیے انہوں نے عربی زبان و ادب کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی، کیوں کہ تحقیق ہو یا تنقید، صحافتی ادب ہو یا علمی مقالہ نگاری، مغربی زبانوں میں جس انداز میں کام ہوا ہے اگر مشرق کا کوئی اسکالر جس کو اپنی زبان و ادب سے لگاؤ اور واقفیت ہو اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب میں بھی اس کا مطالعہ وسیع ہو تو اس کی تحریروں کا انداز بدل جاتا ہے، خلیل مردم کے زمانہ کے ادیبوں اور شاعروں کو عموماً مغربی زبان و ادب سے پوری واقفیت نہیں تھی، بعد میں وہ نسل سامنے آئی جس کو انگریزی سے زیادہ فرانسیسی زبان و ادب کو پڑھنے اور سیکھنے کا شوق تھا اور اس کی وجہ بھی تھی کہ فرانسیسی سامراج کے اثرات اور شام میں زیادہ طاقت ور تھے، خلیل مردم کی محنت و ذہانت سے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی مسائل میں ان کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی نے ان کو سُرخ رو رکھا، ان خوبیوں کی بہ دولت وہ کئی بار وزیر و سفیر بنائے گئے، علمی و انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف تھا کہ وہ کرد علی کے بعد المجمع العلمی الادبی کے (رئیس) صدر مقرر ہوئے اور اس کے وقار کو انہوں نے اس طرح آگے بڑھایا کہ مشرق سے

لے کر مغرب تک عربی زبان وادب کے محققین اور مصنّفین سے روابط کو استوار کیا، ان کی شخصیت میں عجیب جاذبیت اور کشش تھی، سنجیدگی اور وقار کے ساتھ محبت وشفقت کی آمیزش ایسی تھی کہ ان سے ملنے والا مرعوب ہونے کے بجائے ان کا فریفتہ ہو جاتا، انہوں نے علمی وادبی زندگی میں سیاسی اور مذہبی اختلافات سے خود کو دور رکھا، ان کی ہدایت تھی کہ سطحی اختلافات سے دوری سے کام میں برکت اور پائیداری آتی ہے۔

خلیل مردم کے معاصرین میں علمی، ادبی، سیاسی اور دینی اعتبار سے شہرت پانے والوں میں عبدالقادرالمغربی، شیخ رشید رضا، شکیب ارسلان، عبدالرحمان الکواکبی، طاہرالجزائری اور کردعلی قابل ذکر ہیں، ان ادیبوں اور عالموں میں رشید رضا، شیخ محمد عبدہ کے شاگرد رشید اور ان کے علمی اور فکری جانشین کی حیثیت سے اہم ہیں، دولت عثمانیہ کے حکام کی بے راہ روی پر انہوں نے تنقید کی اور اس تنقید میں تنقیص کے بجائے اصلاح مقصود تھی لیکن جب کسی حکومت کا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ کمزور ہو جاتا ہے تو حکمراں طبقہ کو دوست اور دشمن کی تمیز بھی نہیں رہ جاتی، چنانچہ جب شام کی سرزمین رشید رضا کے لیے تنگ ہوگئی تو وہ اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور مصر میں پناہ لی، مصر کے علمی اور دینی حلقوں میں ان کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، ان کا دائرہ عمل زیادہ تر دینی علوم کے لیے خاص رہا، ان کی تصنیفوں میں تاریخ الاستاذ الامام سب زیادہ اہمیت کی حامل ہے جو دراصل الاستاذ الامام کی تاریخ تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے دور کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ کا گہرا اور سنجیدہ مطالعہ ہے، تاریخ الاستاذ الامام کے بعد ان کا رسالہ المنار خاص طور سے قابل ذکر ہے، جس میں ہر فکر اور مسلک کے لوگ اپنی رائے کا اظہار کرتے، المنار کے صفحات ہی سے رشید رضا کی تفسیر المنار لوگوں تک پہنچی اور اس کو عام مقبولیت حاصل ہوئی، المنار کے اثرات صرف عرب ملکوں ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں محسوس کیے گئے، یہاں تک کہ ہندوستان کے علما نے بھی تفسیر المنار سے فائدہ اٹھایا، جن میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور علمائے دیوبند قابل ذکر ہیں، رشید رضا کے بعد شام کے حلقہ میں شکیب ارسلان کو شہرت حاصل ہوئی، عرب اور عرب قومیت سے لگاؤ کے باوجود انہوں نے دولت عثمانیہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ دل سے خلافت

عثمانیہ کے وقار اور اس کے وجود کی بقا چاہتے تھے، اسی لیے انہوں نے بہت ہی سکون کے ساتھ شام اور یورپ کے ممالک میں رہ کر اپنے علمی سفر کو باقی رکھا اور ہر حلقے میں ہر دل عزیز ہوئے، عبدالرحمان الکواکبی حلب میں پیدا ہوئے، حلب کی سرزمین ترکی سے ملی ہوئی تھی، وہ حلب میں بیٹھ کر ترکی حکام کی زیادتیوں اور بدعنوانیوں کو دیکھ رہے تھے، اس لیے ان کے ضمیر نے کبھی بھی غیر سنجیدہ حکام کی تعریف گوارا نہیں کی بلکہ حکام کی غلطیوں اور بدعنوانیوں کی نشان دہی کی، پاداش میں ان کو وطن عزیز چھوڑنا پڑا اور رشید رضا کی طرح انہوں نے بھی مصر میں پناہ لی، جہاں انہوں نے دو اہم کتابیں ام القری اور طبائع الاستبداد تصنیف کیں، یہ دونوں کتابیں مذہبی، سیاسی، سماجی اور تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ان کتابوں کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے ساتھ اس دور کی سیاسی اور سماجی بدحالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ان تینوں ادیبوں اور عالموں کا علمی اور دینی سرمایہ تمام عرب ممالک کے علما، ادبا اور سماجی ماہرین کے لیے بہت ہی موقر علمی ذخیرہ کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں تک خلیل مردم کا تعلق ہے وہ اسلامی اور عرب ممالک کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے لیکن سیاسی اور سماجی مسائل میں الجھنے کے بجائے انہوں نے علمی اور ادبی راستہ اختیار کیا، ان کا نظریہ یہ تھا کہ عرب نوجوانوں کو جب عربی زبان و ادب کے قدیم سرمایہ اور جدید ادبی اور فکری رجحانات سے صحیح معنوں میں واقفیت ہوجائے گی تو وہی لوگ اپنے ملک، اپنی زبان، اپنے مذہب اور اپنی ثقافت کے صحیح معنوں میں خادم ہوں گے اور ان ہی کے ذریعے عربی زبان و ثقافت کا بول بالا ہوگا، چنانچہ انہوں نے علمی و ادبی انداز میں قدیم عربی زبان و ادب کے ادیبوں، شاعروں اور مصنّفین کا تعارف کرانا شروع کیا، جیسے ابن المقفع، جاحظ، عبدالحمید الکاتب، جریر، فرزدق، ابوتمام، بحتری، متنبّی اور ابوالعلاء المعری، یہ مقالات جہاں علمی و ادبی اعتبار سے نہایت اعلا معیار کے حامل ہیں وہیں تنقیدی اعتبار سے بھی ان کی بڑی اہمیت ہے، اسی طرح کے علمی و تنقیدی مقالات کا نئے دور میں فروغ ہوا جن میں لکھنے والے کی علمی و ادبی مہارت کے ساتھ ساتھ فنی اور تنقیدی شعور بھی پوری طرح مترشح ہوتا ہے، ان مقالات کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کے ادیبوں میں طٰہٰ حسین، عباس محمود العقاد، عبدالقادر المازنی اور ڈاکٹر احمد امین کے مقالات کا جو معیار ہے، خلیل مردم کے مقالات کا بھی تقریباً وہی

معیار ہے، اس کے علاوہ انہوں نے قدیم عربی دواوین کی مخطوطات کے تحقیق و تنقیح کا کام کیا اور ان پر مقدمے لکھے ہیں یہ بھی غیر معمولی ہیں جن سے ان کی تحقیقی نظر اور شعر فہمی کے ذوق کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شام کی علمی وادبی تاریخ میں کرد علی اور خلیل مردم کا کوئی مدمقابل نہیں ہے، دونوں ادیبوں نے المجمع العلمی کے ذریعے زبان و بیان اور تصنیف و تحقیق کے جو اصول اور معیار چھوڑے ہیں، وہ ہمیشہ مصنّفین اور محققین کے لیے نمونہ رہیں گے، شام کا یہ مایہ ناز ادیب و محقق تقریباً ۶۴ رسال تک عربی زبان وادب کی خدمت کرتے ہوئے ۱۹۵۹ء میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور اپنی زندگی کے عزیز علمی وادبی سرمایہ کو چھوڑ گیا تاکہ آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہوتی رہیں۔

مصادر و مراجع

۱- دیوان ابن جهم، تحقیق خلیل مردم بک، دمشق ۱۹۴۶ء۔

۲- الشعر السوری الحدیث، سامی الدہقان، دمشق ۱۹۶۰ء۔

۳- الوحی المحمدی، رشید رضا، مصر ۱۹۵۵ء۔

۴- مقدمه دیوان خلیل مردم بك، جمیل صلیبا، دمشق۔

۵- الاتجاهات الفكرية فی بلاد الشام، جمیل صلیبا، دمشق ۱۹۵۸ء۔

۶- شعر الحماسة والعروبة فی بلاد الشام، امجد الطرابلسی، دمشق ۱۹۵۷ء۔

۷- محاضات عن عبد القادر المغربی، محمد اسعد طلسی، مصر ۱۹۵۸ء۔

۸- امراء البيان، کرد علی، مصر ۱۹۳۷ء۔

۹- خطط الشام، کرد علی، دمشق ۱۳۴۳ھ۔

۱۰- مذکرات، کرد علی، دمشق ۱۳۶۷ھ۔

۱۱- الادب العربی المعاصرفی سورية، سامی الکیالی، جامعۃ الدول العربیۃ، دار المعارف ۱۹۵۹ء۔

۱۲- جمهرة المغنیین، خلیل مردم بک، دمشق ۱۹۶۴ء۔

۱۳- شعراء الشام فی القرن الثالث، خلیل مردم بک، دمشق ۱۹۲۶ء۔

سرشاہ محمد سلیمان مرحوم

جناب شاہ ظفر الیقین صاحب

فخر روزگار روزمان، مایہ علم و دانش، سرتاج دانش وران، صاحب فضل و عرفان ڈاکٹر سر سلیمان (۱) بیرسٹر و سابق جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا، وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، فیلو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز آف انڈیا و نائب صدر اردو و کلکتہ میتھمیٹکل سوسائٹی وصدر انڈین اکاڈمی آف سائنسز الہ آباد پر ایک طالب علم کے لیے کچھ لکھنا شاید جسارت بے جا ہو مگر ڈاکٹر صاحب کو جو محبت میری نانی بی بی مرحومہ (۲) سے تھی اور جن کے واسطہ سے میں سلمہ نانی (بنت سرشاہ) اہلیہ جناب چودھری اختر حسین ایڈوکیٹ مرحوم سے ملا اور انہوں نے جس محبت اور خلوص سے سرشاہ کے وہ خطوط جو انہوں نے اپنے والد محترم اور والدہ محترمہ کو یورپ سے بھیجے تھے میرے حوالہ کر دیے، جو کئی ماہ میرے پاس بحمد اللہ محفوظ رہے تو ان کی عنایت و شفقت نے یہ ہمت پیدا کی کہ میں اپنی تمام ہیچ میزری کے باوجود سرشاہ محمد سلیمان مرحوم پر کچھ لکھنے کی جرأت کروں تا کہ موجودہ دور کے لوگوں کو معلوم ہو کہ مرحوم کون تھے؟ کیا تھے؟ کیسے تھے؟

سرشاہ مرحوم نسباً فاروقی تھے، سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے:

سرشاہ محمد سلیمان بن مولوی شاہ محمد عثمان وکیل جون پور ابن شاہ خادم علی (وکیل جون پور) ابن شاہ عبدالباری بن شاہ محمد بن شاہ عبدالحق (۳) بن شاہ محمد واجد بن شاہ محمد شاہ بن مخدوم شاہ اسماعیل بن حاجی ابوالخیر بن مخدوم (۴) شیخ ابوسعید بن شیخ معروف ثانی بن شیخ عثمان بن شیخ محمد ماہ بن شیخ چاند بن مخدوم شیخ معروف (۵) اول بن مخدوم شیخ مشید بن شیخ خضر (۶) بن سلطان غیاث الدین محمد بن سلطان تاج الدین محمد بن سلطان عزالدین میمن سلطان سلیمان (۷) شاہ بن سلطان

محلّہ پہاڑ پور، نزد نسواں انٹر کالج، اعظم گڈھ۔

نعمان شاہ ثانی بن سلطان احمد فرخ شاہ کامل بن سلطان نعمان شاہ بن مسعود (۸) بن عبداللہ (۹) ابن واعظ الاصغر بن واعظ الاکبر بن ابوالفتح بن امام اسحاق بن ابراہیم (۱۰) بن ناصرالدین (۱۱) (امام سالم) بن عبداللہ بن خلیفہ عمرؓ۔ (رسالہ جبر واختیار مصنفہ ملا محمود جون پوری، مقدمہ انگریزی از علی مہدی خاں، ص ۱۵ تا ۳۵)

سرشاہ کی والدہ محترمہ میمونہ بی بی حافظ شاہ عابد حسین وکیل (۱۲) کی صاحب زادی تھیں جن کا سلسلہ نسب یہ ہے:

حافظ عابد حسین بن شیخ محمد موسی بن شاہ غلام فرید بن ملا سراج عبدالسبحان بن ملا محمد یوسف بن ملا عبدالستار۔

ملا عبدالستار ملا محمد جون پوری صاحب شمس بازغہ (۱۳) کے حقیقی بھانجے اور جانشین تھے۔

شاہ خادم علی صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے جونپور میں وکالت شروع کی، ۱۸۵۷ء سے پہلے بہ حیثیت وکیل ان کو کافی شہرت حاصل تھی، ان کے بڑے صاحب زادے مولوی محمد فاروق (۱۴) تھے جن کی شادی چڑیا کوٹ میں ہوئی تھی (شادی ۲۴ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء کے قریب ہوئی، مقدمہ دیوان فدائی، ص ۵)، دوسرے صاحب زادے مولوی شاہ محمد عثمان صاحب تھے، ان کی پیدائش ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) میں بھیرا میں اور تعلیم و تربیت جون پور میں ہوئی، تکمیل مدرسہ حنفیہ جون پور میں، وہ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری کے شاگردوں میں تھے اور شاعری میں مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری (۱۵) کے شاگرد تھے، فارسی، اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے، نمونہ کلام یہ ہے:

جینا آزار ہوگیا ہے — مرنا دشوار ہوگیا ہے
جو داغ وفا تھا دل میں روشن — وہ شمع مزار ہوگیا ہے
سرمایۂ تشنۂ جوانی — پیری میں خمار ہوگیا ہے
کچھ ٹھیک نہیں دل و جگر کا — جب سے غم یار ہوگیا ہے (۱۶)

شاہد و ساقی و مطرب ہمہ مطلوب من است
کیش من پیروی پیر مغانے دارد (۱۷)

استاد حضرت مولانا عبدالعلیم آسی خانقاہ رشیدیہ (۱۸) کے سجادہ نشین تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

حرص دولت کی نہ عز و جاہ کی
اک مسرت ہے ازل آگاہ کی

اس کا اثر یہ بھی تھا، کہتے ہیں:

اپنی اس فقیری میں نہ کچھ مال ہے نہ زر ہے
تھا اک دل آگاہ وہ اللہ کا

اس کے ساتھ ان کی شاعری میں مومن کا رنگ تھا، فرماتے ہیں:

بوالہوس ہوں گے جو کہتے ہیں ستم کرتے ہیں
سچے عاشق پہ تو معشوق کرم کرتے ہیں
ایک وہ ہیں کہ ستم توڑ رہے ہیں ہم پر
ایک ہم ہیں کہ سمجھتے ہیں کرم کرتے ہیں (۱۹)

مولوی عثمان صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے مگر فہیم وزیرک اتنے تھے کہ فریق مخالف کی انگریزی بحث سمجھ لیتے تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ درج ذیل ہے:

پنڈت موتی لال نہرو نے ایک مقدمہ میں فریق مخالف کی طرف سے انگریزی میں ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں کئی گھنٹے بحث کی اور مولوی شاہ محمد عثمان نے اردو میں جوابی بحث کی، جب پنڈت نہرو کو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب انگریزی نہیں جانتے ہیں تو حیرت سے مولوی صاحب سے بغل گیر ہو گئے۔ (۲۰)

بحث کے ساتھ ساتھ مسودہ نویسی میں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے، شرع محمدی اور اوقاف کے ماہر تھے، ہمت اعلا پائی تھی، جو ہر قابل تھے، بہ یک وقت شاعر، وکیل اور عالم دین تھے، ۱۳/ دسمبر ۱۹۱۹ء میں انتقال ہوا اور گلاب باڑی الہ آباد میں مدفون ہیں، ریاض خیر آبادی نے ۳۵/ اشعار کا قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے جس کے تین شعر یہ ہیں۔ (۲۱)

خاک پر وہ نہیں ہیں وہ ہیں تہ خاک

خلد میں اب ہیں ، محمد عثمان

نظم اردو میں اگر مومن و میر

فارسی نظم میں خسرو کی زبان

بولی بو ''گل'' سے نکل کر پے سال

گئے جنت میں محمد عثماں

۷ ۳ ۳ ۱ ھ

ایسے خانوادہ علم وادب میں سرشاہ محمد سلیمان ۳؍فروری ۱۸۸۶ء کو جون پور میں پیدا ہوئے، زمانہ کے دستور کے مطابق گھر پر فارسی وعربی کی تعلیم مولوی اسماعیل صاحب سے پائی، اس کے بعد جامع مسجد جون پور کے مدرسہ ربانیہ قرآنیہ (۲۲) میں حاصل کی، انگریزی کی تعلیم کے لیے مقامی مشن اسکول (۲۳) میں داخل کرایا گیا، یہاں پر بابو پیریا ناتھ گھوش ہیڈ ماسٹر، مولوی فصیح الدین، مولوی سید محمد سرسینا اور بابو درگا دت سے جدید تعلیم حاصل کی۔(۲۴)

اس زمانہ کا ایک اور واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، مولوی شاہ محمد عثمان صاحب کے قدم بہ قدم ایک خوبصورت اور سنجیدہ بچہ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس خانقاہ (۲۵) میں داخل ہوا، تخت کے قریب آکر بڑے ادب سے جھک کر حضرت آسی کو تسلیمات عرض کی، حضرت شاہ صاحب قبلہ نے بچہ کو گود میں اٹھا لیا اور شفقت سے سر پر دست مبارک پھیرتے رہے، وکیل صاحب (۲۶) کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ بچہ کی بلند پیشانی اور روشن نگاہیں بتارہی ہیں کہ اپنے زمانہ میں فاضل قانون داں بیٹا ہی نہ ثابت ہوگا بلکہ اپنے وقت کا ''سلیمان'' ہوگا اور افق علم و ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے گا۔(۲۷)

اس واقعہ کو ذہن میں رکھیے اور مورخ اسلام اور سوانح نگار رسولؐ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ان کی وفات پر یہ تاثر ملاحظہ کیجیے ''نئی تعلیم نے ہماری قوم میں جو بہتر سے بہتر نمونے پیش کیے ان میں سے ایک سرشاہ سلیمان تھے...... مرحوم ہندوستان کا وقار اور مسلمانوں کا فخر تھے''۔(۲۸)

مولانا عبدالحئی عباسی سرشاہ سلیمان کے بچپن کے ماحول کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں:

''مولوی شاہ محمد عثمان صاحب بہ یک وقت عالم دین، وکیل اور شاعر تھے، فدائی تخلص کرتے تھے، مولوی صاحب کی کوٹھی پر شام کو صحن میں اہل علم وفکر کا ایک قابل رشک حلقہ ہوتا تھا، ایک طرف اپنے دور کے فلسفی اور منطقی بزرگ مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری ہیں تو دوسری علم قرآن کو فروغ دینے والے ممتاز خاندان فاروقی کے عالم مولانا شبلی صاحب خلف مولانا سخاوت علی صاحب عمری اور سنجیدگی ومتانت کے پیکر، نوجوان عالم مولوی ابوبکر محمد شیث رونق افروز ہیں، شگفتہ مزاج شاعر حفیظ جون پوری گوشہ گیر ہیں، ایک بانکے ترچھے نوجوان حافظ عبدالرحمان ایڈیٹر ''جادو'' بھی بیٹھے ہیں، فقہ حنفیہ کے عالم مولانا عبدالاول صاحب خلف مولانا کرامت علی تشریف فرماہیں، علامہ فاروق چریاکوٹی، مولوی نجم الدین چریاکوٹی، علامہ شبلی نعمانی مصنف ''سیرۃ النبیؐ'' اکثر دینی وعلمی مسائل میں مولوی شاہ محمد عثمان صاحب سے مشورہ کرنے جونپور تشریف لاتے، مولوی صاحب کے رفیق مولوی محمد مصطفیٰ صاحب ولید پوری مشوروں میں شریک رہتے، ڈسٹرکٹ، جج، منصف اور وکلاء روز کے درباریوں میں ہوتے تھے، شرح محمد کے کسی نکتہ پر یا داغ کی شاعری پر گفتگو چھڑ جاتی تو بڑے سے بڑے مسئلے باتوں باتوں میں حل ہوجاتے''۔(۲۹)

سرشاہ جون پور سے الہ آباد کے مشہور زمانہ میور کالج میں تعلیم حاصل کرنے گئے، یہیں سے ۱۹۰۶ء میں بی، اے کے امتحان میں پوری الہ آباد یونی ورسٹی میں ٹاپ کرنے پر حکومت نے اسکالرشپ دے کر اعلا تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنے کی تجویز پیش کی۔(۳۰)

سرشاہ بمبئی سے ۱۹؍ستمبر ۱۹۰۶ء کو شنبہ کے دن جہاز ارکیڈیا پر انگلستان کے لیے روانہ ہوئے (۳۱)، ۲؍اکتوبر کو ۱۲؍بجے رات میں عدن پہنچے، (۳۲) یہاں سے بحر احمر براہ نہر سویز ہوتے بندرگاہ سعید اور پھر وہاں سے بحر اخضر ہوتے ہوئے مارسلز پہنچے، یہاں سے بذریعہ ریل ۱۴؍اکتوبر کو بروز یکشنبہ بہ وقت صبح لندن پہنچ گئے۔(۳۳)

لندن پہنچ کر سرشاہ نے کیمبرج کے کرائسٹ چرچ مشن کالج میں داخلہ لیا، سرشاہ لندن میں بھی پکے مسلمان رہے، حرام وحلال کا ہر بات میں خیال رکھا، والدہ محترمہ کو لکھتے ہیں ''آج گوشت کھانے کی خواہش ہوئی تو بازار سے زندہ مرغی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے ذبح کی، چند دوستوں کے ساتھ مل کر پکا کر کھایا''، والد محترم کو لکھتے ہیں ''کتابوں کے ہمراہ ایک ناخن گیر بھی آیا

ہے، اس کے پہنچنے سے طبیعت بے حد خوش ہوئی، اس وجہ سے اور بھی کہ میں خود ایک ناخن گیر کی فرمائش کرنے والا تھا، ایک دوسری نہایت ضروری چیز جس کو میں لکھنے کی فرمائش کرنے والا تھا، وہ پیلو کی مسواک ہے، ایک نیم کی مسواک اپنے ساتھ لے آیا تھا، اس سے اب تک برابر کام لیا ہے لیکن اب وہ قابل استعمال باقی نہیں رہ گئی ہے، منجن استعمال کرتا ہوں لیکن برش طبیعت قبول نہیں کرتی (۳۴)، شاید انہیں وجوہات کی بنا پر، مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند واڈیٹر برہان لکھتے ہیں، ''اپنی ذہانت وطباعی اور اعلا قانونی وعلمی قابلیت ولیاقت کے باعث جس طرح وہ سرزمین ہند کے لیے مایہ صد افتخار و نازش تھے، اسی طرح اپنے سچے اور پکے مذہبی معتقدات و اعمال کی وجہ سے آج کل کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے باعث ہزار عبرت وموعظت بھی تھے'' (۳۵) اور مصنف سیرۃ النبیؐ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں، ''وہ نہ صرف ہائی کورٹوں کے جج رہے بلکہ قانون کے نکتہ شناس بھی تھے، ان کی لیاقت وقابلیت کی شرح کے لیے چند سطریں کافی نہیں ہوسکتیں، ان سب باتوں کے ساتھ وہ مسلمان بھی تھے، ایماناً وعملاً مسلمان اور وہ ان تنگ ظرفوں میں نہ تھے جو رومن حروف کے چند الفاظ پڑھ لینے کے بعد اپنے کو حقائق ومعارف کا سب سے بڑا عارف مان کر دین ومذہب سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ (۳۶)

وہ نہ صرف کورس کی کتابوں کا بہ غور مطالعہ کرتے تھے بلکہ انہوں نے دوران تعلیم میں روشنی اور مادہ کی ماہیت پر بہت سی کتابیں پڑھیں اور بہت کچھ غور وفکر بھی کیا، ریڈیون (Radion) کے متعلق اپنے نظریات کو نوٹ کی شکل میں جمع کر لیا جن کو تیس سال کے بعد ایک مبسوط نظریہ کی صورت میں پیش کیا (۳۷)، وہ صرف اپنی ذاتی محنت ومشقت ہی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ خداوند قدوس کی رحمت اور توفیق کے بھی طالب رہتے تھے اور اپنی کامیابی کے لیے ماں باپ سے بھی دعاؤں کی درخواست کرتے رہتے تھے، چنانچہ والد محترم کو لکھتے ہیں:

''آئندہ سالانہ امتحان ابتدائی جون میں ہوگا، میں آپ لوگوں کی دعا کا خواستگار ہوں''۔ (۳۸)

۱۹۰۹ء میں انہوں نے ریاضی کا ٹرائی پاس (Tripas) پاس کیا اور اسی سال وہ آئی، سی، ایس کے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن نامزد نہ ہوسکے، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

پروفیسر عثمانیہ یونی ورسٹی نے اس پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں ''یہ واقعہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اس قسم کے مقابلتی امتحانات قابلیت کے صحیح معیار نہیں ہوتے، آج کسی نے ان ۵۰/ امیدواروں کا نام کہیں پڑھا اور سنا نہیں ہوگا، جنہیں اس وقت ڈاکٹر محمد سلیمان پر ترجیح دی گئی تھی، حالاں کہ ان میں سے بعض کا تقرر خود عدلیہ کے محکمہ میں بھی ہوا ہوگا'' (۳۹) مگر جیسا کہ سرشاہ کے بھانجے عبدالحئی عباسی لکھتے ہیں ''شاہ صاحب کی ناکامی ملک وملت نیز ان کے لیے رحمت ثابت ہوئی''، ان کے ساتھی آئی سی ایس زیادہ سے زیادہ ممبر آف ریونیو ہوکر ختم ہوگئے'' (۴۰)، ۱۹۱۰ء میں سرشاہ نے بیرسٹری کا امتحان ال، ال، ڈی جامعہ ڈبلن (آئرلینڈ) سے پاس کیا، ۱۹۱۱ء میں قانون کی ایک دوسری ڈگری لی۔ (۴۱)

ان تمام کامیابیوں کی خوشی میں کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن کی جانب سے سرشاہ کو ۱۲/ فروری ۱۹۱۱ء کو یونی ورسٹی ارٹلس ہوٹل میں الوداعی ڈنر دیا گیا، جس کو سرشاہ نے محض اپنے دوستوں اور مخلصوں کے اصرار سے قبول کیا ورنہ وہ ۲۳/فروری ہی کو ہندوستان واپس ہونے والے تھے، اس ڈنر میں تقریباً چالیس احباب شریک ہوئے، اس کے بعد ۲/ مارچ کو جہاز کلبڈ وینا سے روانہ ہوکر بمبئی ۲۴/ مارچ کو پہنچ گئے۔

جب سرشاہ جون پور پہنچے تو تمام اعزہ، احباب اور اہل شہر کی ایک بڑی تعداد نے ریلوے اسٹیشن پر پورے جوش وخروش سے استقبال کیا اور شہر کی شاہ راہوں سے سرشاہ کی سواری گزرتی ہوئی گھر پہنچی۔

شروع کے تین سال اپنے والد محترم کے ساتھ ہی جون پور کی ابتدائی دیوانی عدالتوں میں پریکٹس کر کے وکالت پر عبور حاصل کیا، ۱۹۱۴ء میں جب کہ سرشاہ کی عمر صرف ۲۸ سال تھی، الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی (۴۲)، اس وقت الہ آباد میں سرراس السٹن، مولوی ناصر مجتبیٰ صاحب، سرسندر لال، پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو، پنڈت موتی لال نہرو اور سرتیج بہادر سپرو وغیرہ جیسے مشہور اور کہنہ مشق قانون داں پریکٹس کرر ہے تھے، قانون کے ایسے باکمال لوگوں کے سامنے سرشاہ نے اپنا چراغ جلایا اور اپنی مدلل بحث اور نظائر کے جوابوں کی وجہ سے بری شہرت اور مقبولیت حاصل کی کی، چوں کہ طبیعت میں بلا کی تیزی تھی اس لیے حوالے جو کئی کئی

صفحوں کے ہوتے تھے، اتنی روانی سے پیش کرتے تھے کہ بعض دفعہ انگریز جج مداخلت کر کے کہتا کہ ذرا حوالے رک رک کر پیش کیجیے کہ ہم نوٹ کرسکیں (۴۳)، اس غیر معمولی قانونی مہارت کی بنا پر جب کہ ان کی عمر چونتیس برس کی تھی، انگریز چیف جسٹس نے ہائی کورٹ کی ججی پیش کی اور ۱۹۲۳ء میں سر محمد رفیق کے جانشین کی حیثیت سے سر شاہ مستقل جج ہوگئے۔

اسی درمیان ۱۹۱۷ء میں سر شاہ کی کوششوں سے نواب عبدالمجید بار ایٹ لا لال کوٹھی، یوسف منزل سول لائن الہ آباد میں اسلامیہ اسکول قائم ہوا، اس کے تاسیسی ممبروں میں سر شاہ، نواب عبدالمجید جون پوری ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر ولی اللہ اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سابق پروفیسر وصدر شعبہ عربی الہ آباد یونی ورسٹی رکن مجلس ادارت معارف جیسے لوگ تھے، اس کے بعد بخشی بازار میں ابوالحسن جعفری صاحب کے مکان میں اسکول منتقل ہوا۔ (آج کل اسی جگہ پر شاہ وصی اللہ صاحب کی خانقاہ ہے) جب یہاں بھی جگہ کم پڑی تو کوتوالی کے پاس بوچڑ کا محل نامی مکان میں اسکول منتقل ہوا، اس زمانہ میں محلّہ کڑا میں سلاٹر ہاؤس کے قریب ہی ایک ٹینری تھی جو گھاٹے کی وجہ سے بک گئی تھی، اس کے خریدنے والے غضنفر اللہ صاحب ٹھیکے دار تھے، (ذوالفقار اللہ صاحب کے بڑے بھائی) سر شاہ جو کہ اسکول کے صدر تھے، ان کو جب اس زمین کا پتہ چلا کہ وہ بکنے والی ہے، تب وہ مطلوبہ رقم (بہ قول حاجی محمد عثمانی صاحب ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج الہ آباد، ۲۸/ہزار اور بہ قول سرفراز حسین موجودہ پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج ۵/ہزار اور اتنے ہی میں غضنفر اللہ صاحب نے ٹینری خریدی تھی) کے لیے اپنے دوست نواب محمد یوسف ابن نواب عبدالمجید کے پاس گئے تو نواب صاحب نے چک بک اپنے دوست سر شاہ کے ہاتھ میں دے دی، سر شاہ نے جب مطلوبہ رقم لکھ دی تو نواب صاحب نے کہا بس، چوں کہ اب تک نواب عبدالمجید کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی اور ان کے صاحب زادوں کی خدمات دیکھتے ہوئے اب جب کہ ۱۹۲۴ء میں اسکول اپنی بلڈنگ میں آرہا تھا تو اس کا نام مجیدیہ اسلامیہ اسکول رکھا گیا، اس وقت یہ مڈل اسکول تھا آج بھی پرنسپل آفس وغیرہ اسی ٹینری کے منیجر کی اقامت گاہ اور آفس کی بلڈنگ میں ہے، خیر ۱۹۲۸ء آتے آتے سر شاہ علی گڑھ سے وابستہ ہوگئے اور یہاں کے صدر سر شفاعت احمد خاں ہوئے جو ۱۹۴۰ء کے بعد تک رہے۔

۲۲/ مارچ ۱۹۲۴ء کو پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ جات متحدہ منعقدہ بدایوں کی صدارت کی اس میں آپ نے فرمایا، اس میں کچھ شک نہیں کہ جس طرح قدیم زمانہ کی تعلیم میں روحانیت کو مقدم رکھا جاتا اور اخلاقی و مذہبی تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، اسی طرح موجودہ تعلیم میں جسمانی اور دماغی نشو ونما کو زیادہ ضروری سمجھا جاتا ہے (۴۴) مگر پھر بھی آپ نے زمانہ کی ضرورت کے مطابق انگریزی تعلیم پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے کالج خود کھولیں اصل الفاظ یہ ہیں ''میں اس کو بہت ضروری خیال کرتا ہوں کہ طبقہ مسلم اپنی تعلیم کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لے اور بچوں کی تعلیم کے لیے اپنی جداگانہ درس گاہیں قائم کرے''۔(۴۵)

تعلیم و تعلم کی اہمیت اور طبقہ نسواں کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> ''تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے، بغیر تعلیم کے نخل ترقی کی شاخیں ٹھٹھر جاتی ہیں لیکن آبادی کے نصف حصہ کو تعلیم دینے اور دوسرے نصف حصہ کو جاہل رکھنے سے تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی، طبقہ مذکور کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو طبقہ نسواں کی تعلیم بھی چلنی چاہیے (۴۶)، عورتوں کے ذریعۂ معاش کی تلاش کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں ''ہندوستانی خواتین کے لیے دو شغل خاص طور پر مناسب ہیں یعنی ڈاکٹری اور مدرسی'' (۴۷)، پھر اس کے وجوہ بیان کیے ہیں''۔(۴۸)

انگریزوں کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو تعلیم کے نصاب میں داخل کرنے پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ذرا محاربات مقدس اور حروب صلیبیہ کو جن کی بہ دولت اتنی خوں ریزیاں واقع ہوئیں، یاد کیجیے سنٹ بارتھے، مونادانے کے قتل عام کا خیال فرمائیے، شمالی مغربی یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ جماعتوں کی نامتناہی معرکہ آرائیاں دیکھیے، انگریز پروٹسٹنٹ مقتولین پر نظر ڈالیے، ہسپانوی (دارالافتا) کی یورش انگیز عقوبتوں کا تماشا دیکھیے اور پھر انصاف فرمائیے کہ معاصر اقوام کی اس زندگی کے مقابلہ میں ہندوستان میں ہمارے اسلاف کا طرز عمل، نسلی، مذہبی اور معاشرتی اختلافات کے باوجود زیادہ باامن اور روادارانہ تھا''۔(۴۹)

اسی سال ستمبر میں انہوں نے قصائد ذوق کو نئی ترتیب سے شائع کیا، اس میں قصائد کے علاوہ قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں، اس انتخاب کے شائع کرنے کا آپ کے سامنے کیا

مقصد تھا اور یہ کتنی جلدی وجود میں آیا، اس کو نظامی بدایونی کی زبان سے سنیے، مرحوم سے میری پہلی ملاقات مارچ ۱۹۲۴ء میں ہوئی جب کہ وہ صوبہ کی مسلم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کے لیے بدایوں تشریف لائے تھے، اس وقت تک میرے مرتبہ دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن شرح کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر نکل چکے تھے اور ایک نسخہ معری فرہنگ کے ساتھ جس میں مرزا غالب کی خودنوشت سوانح عمری شامل ہے، آٹھ بڑی تقطیع پر شائع ہو چکا تھا، اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ یہ ان کی نظر سے گزر چکے تھے اور اس لیے میں معنوی طور سے ان کے لیے اجنبی نہ تھا، اس وجہ سے پہلی ملاقات میں دیر تک مرزا غالب کی شاعری کا تذکرہ رہا، سرشاہ نے اسی سلسلہ میں ذوق کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور فرمایا کہ نظامی پریس نے غالب کے تو کئی ایڈیشن چھاپے اور ذوق ایسے استاد کو کیوں فراموش کر دیا، میں نے عرض کیا کہ آپ کو ذوق کے کلام سے ذوق ہے تو آپ نظامی پریس کی اس کمی کو پورا کر دیں، مجھے اس ملاقات میں اثبات یا نفی میں اس کا کوئی جواب نہ دیا لیکن پانچ مہینے کے بعد دوسری دفعہ جب میں مرحوم سے الہ آباد میں ملا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قصائد ذوق کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ میز پر رکھا ہوا ہے، مجھ سے فرمایا کہ لیجیے آپ کی فرمائش پوری ہوگئی اور کہا خدا سے دعا کیجیے کہ میں نے اردو ادب کی جو خدمت شروع کی ہے اس کا سلسلہ جاری رہے''۔(۵۰)

اس مجموعہ میں قصائد کی ترتیب کیا رکھی اور کیا رکھنا چاہتے تھے، یہ خود سرشاہ کی زبان سے سنیے ''میری خواہش تھی کہ ترتیب بہ لحاظ زمانہ ہو لیکن مجھے کسی دیوان یا تذکرہ حتی کہ دیوان مرتبہ حضرت آزاد سے ہر قصیدہ کا سال تصنیف معلوم نہ ہو سکا، اس لیے مجبوراً ترتیب ردیف وار کو ترجیح دی اور بعض قصائد ناتمام تھے وہ درج کیے گئے، افسوس ہے کہ مثنوی بھی نامکمل تھی ورنہ لاجواب ہوتی، پھر بھی قدرت کلام کا پتہ دیتی ہے، حضرت آزاد کے مجموعہ میں قطعات و رباعیات بالکل منتشر و بلاترتیب درج تھے، ان کو بھی ردیف وار درج کیا گیا ہے''۔(۵۱)

اس مجموعہ میں ۲۳/قصائد، ۳۲/قطعات اور ۱۳/رباعیات کے علاوہ سہرا اور ناتمام مثنوی بھی درج کی گئی ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد ان کو خیال پیدا ہوا کہ ''غالب کے منتخب دیوان نے زیادہ

مقبولیت حاصل کرلی، کاش ذوق کے دیوان کا بھی انتخاب ہوا ہوتا تو موجودہ حالت سے زیادہ مقبول ہوتا''۔(۵۲)

مگر چونکہ یہ انتخاب بہ قول سرشاہ ''ایک انگریزی داں کے نقطۂ نگاہ سے کیا گیا ہے(۵۳)، جس کی وجہ یہ تھی کہ نوجوانان قوم کو جو اکثر ادب اردو سے نا آشنا ہوتے ہیں، یہ موقع ہاتھ آئے کہ اردو شاعری کے ایک مستند استاد کے کلام کو نئے لباس میں ملبوس دیکھ کر اس کے مطالعہ کی طرف مائل ہوں اور اس کی نازک خیالی، فصاحت اور بلاغت سے لطف اٹھائیں اور معلوم کریں کہ ہماری فراموش کردہ زبان میں بھی کیا کیا جوہر موجود ہیں(۵۴) اور یہی وجہ ہے کہ بہ قول نظامی بدایونی ''انگریزی داں طبقہ میں اس کی قدر کی گئی''۔(۵۵)

اس طرح ستمبر ۱۹۲۶ء میں غزلیات ذوق کا انتخاب شائع کیا، اس میں بہ طور نمونہ ذوق وغالب کا موازنہ بھی کیا گیا ہے، اس میں قصائد، مثنوی، سہرا، قطعات، رباعیات، ہر ایک کا الگ الگ موازنہ کیا ہے اور بہ قول نظامی ''کہیں انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے'' (۵۶)، غزلیات کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں'' غالب پر فارسیت اور فلسفہ کا اتنا اثر تھا کہ اپنے طرز کے شعر کہنے پر مجبور تھے، کلام میں آمد تھی نہ کہ آورد، اس لیے اپنے طرز کو بدل دینا ان کی فطرت کے خلاف تھا اور امکان سے باہر، اس امر کا غالب نے خود اعتراف کیا ہے''۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

برخلاف اس کے ذوق کی زبان روزمرہ کے محاوروں سے مملو ہے، الفاظ فارسی وعربی کا استعمال کثیر ہے لیکن ترکیب فارسی مقابلۃً کم ہے، زیادہ تر اشعار بہ ذات خود مکمل ہیں، کوئی لفظ محذوف نہیں ہے، جو الفاظ شعر میں ہیں وہ اس شعر کے پورے مضمون کو ادا کرنے کے لیے کافی ہیں، ذوق کی غزل کو نثر میں تبدیل کرنا نہایت آسان ہے، زیادہ الفاظ کو بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوگی لیکن غالب کے اشعار میں تصور کو زیادہ دخل ہے۔(۵۷)

۱۹۲۷ء میں موصوف ہی کی صدارت میں یوپی گورنمنٹ نے مسئلہ قضا پر ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں نکاح وطلاق درج رجسٹر ہونے کے امکان پر غور کرنے کے لیے علما نے بھی شرکت منظور کی، ان میں سرفہرست مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا قطب الدین عبدالوالی، مولانا نعیم الدین

مرادآبادی اور مولانا کفایت اللہ دہلوی تھے، ارکان کونسل میں سرفہرست ڈاکٹر شفاعت احمد خاں تھے، اس کمیٹی کی رپورٹ اور علما کا اختلافی نوٹ گورنمنٹ میں پیش ہوا (۵۸)، مگر اس کا حشر معلوم نہ ہوسکا۔

اسی سال ۱۶؍ستمبر کو ہر ہائنس سلطان جہاں بیگم بھوپال بہ حیثیت چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے حکم سے رجسٹرار یونی ورسٹی مذکور نے ایک مطبوعہ اعلان شائع کیا کہ ہر ہائنس نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ہے جس کے ممبر حسب ذیل حضرات ہیں:

۱-آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ (چیرمین)۔ ۲-سر فلپ جوزف (رکن)۔ ۳-سر جارج انڈرسن (رکن)۔ ۴-مسٹر آئی، ایف رحمان (رکن)۔

اس کا اعلان ۲۷؍ستمبر ۱۹۲۷ء کو اخبار لیڈر میں شائع ہوا اور ۱۱؍اکتوبر سے کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا، اس کمیٹی نے جن ۳۴؍اشخاص کے زبانی بیان لیے، ان میں مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، نواب سر مزمل اللہ خاں، سر شاہ محمد سلیمان اور ڈاکٹر ضیاء الدین شامل تھے۔ (۵۹)

اس کمیشن نے ۹؍نومبر ۲۷ء کو اپنی رپورٹ پیش کردی، اس رپورٹ کی کچھ باتوں کی وجہ سے ۹؍فروری ۲۹ء کو سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر وائس چانسلر نے استعفا دے دیا، اب قائم مقام وائس چانسلر سر شاہ کو بنایا گیا، سر شاہ نے بڑی جاں سوزی اور جاں فشانی سے اس خدمت کو سرانجام دیا، ہر جمعہ کو الہ آباد سے آتے، شنبہ، یکشنبہ کو یونی ورسٹی کا کام کرتے اور دوشنبہ کو الہ آباد پہنچ جاتے، آمد و رفت کے اخراجات ہی نہیں بلکہ کھانے پینے اور ٹھہرنے کا بھی خرچ خود ادا کرتے جیسا کہ جلیل قدوائی لکھتے ہیں ''یونی ورسٹی کے دفاتر وکٹوریہ گیٹ کی بالائی منزل پر تھے اور ان کے خاص دفتر کے بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، وہ اپنے دوران قیام میں مختصر ترین سامان کے ساتھ اس کمرہ میں اقامت کرتے، ڈائننگ حال سے کھانا اور ناشتہ منگواتے، وہی جو طلبہ کھاتے تھے اور پیسہ پیسہ ادا کرکے واپس جاتے، سچ یہ ہے کہ وہ اس شعر کا مصداق تھے ؎

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند

در شہنشاہی فقیری کردہ اند

جب وہ ہائی کورٹ کی بڑی تعطیلات میں زیادہ عرصہ کے لیے علی گڑھ آئے تو لیڈی سلیمان اوران کی منہ بولی بہن آنریبل مسٹر محمد حسین بیرسٹر ایٹ لا ممبر کونسل آف اسٹیٹ کی بیگم صاحبہ بچوں اور ملازمین اور سارے ساز و سامان کے ساتھ آئے اور پھوس کے اس بنگلہ میں قیام کیا جس میں سید سجاد حیدر یلدرم رجسٹرار رہ چکے تھے، مگر اس قیام کے دوران میں اسی طرح انہوں نے اپنے دوسرے اخراجات برداشت کیے، چلتے وقت اتنے دنوں کا بنگلہ کا کرایہ بھی یونی ورسٹی کو ادا کر گئے۔(۶۰)

سر شاہ سلیمان نے گورنمنٹ آف انڈیا سے اس وقت جب کہ کمیشن بیٹھنے کی وجہ سے یونی ورسٹی کے ساکھ کو نقصان پہنچ چکا تھا، پندرہ لاکھ روپے یک مشت سرکاری گرانٹ حاصل کی، اردو کو دوسرے مضامین کی طرح بی، اے میں اختیاری مضمون کا درجہ دلوایا، لڑکیوں کے لیے بی، اے تک کی تعلیم کا انتظام کروایا، استانیوں کے لیے ٹریننگ کالج قائم کروایا، جس میں پردہ کا پورا انتظام تھا۔(۶۱)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں ''غالباً مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ مرحوم نے تعطیل کا دن اتوار کے بجائے جمعہ مقرر کیا اور یونی ورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں یہ تجویز پاس کرائی کہ ہر جلسہ کا آغاز تلاوت کلام مجید سے ہو، اس تجویز کے مطابق وہ خود آیت کریمہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تلاوت کرتے تھے اور اس طرح جلسہ کا افتتاح کرتے تھے''(۶۲) اور بہ قول نظامی بدایونی ''جب مسلم یونی ورسٹی کی کشتی ڈگمگا رہی تھی تو آپ نے اس کی ناخدائی کی ذمہ داری قبول کر کے تمام قوم کو ممنون منت بنایا''(۶۳) اور اس طرح ان کے چند روزہ قیام نے ہمارے دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے، رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد سے جو ہیجان علمی و ادبی طبقے میں پھیل گیا تھا اور یونی ورسٹی کی شان جاتی رہی تھی، اس کو از سر نو قائم کرنا دشوار تھا، طلبہ اور استادوں کے علاوہ دوسرے حضرات بھی یونی ورسٹی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، جسٹس موصوف نے جو کچھ کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے، اس کی واقعی قدر و قیمت سے انکار کرنا احسان ناشناسی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ قوم ان کے احسان سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔(۶۴)

انہوں نے تقریباً ۳ رمہینے کے بعد ۲۰ راکتوبر کو سر راس مسعود کو چارج دے دیا، جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تب یونین ہال میں خواجہ مسعود الحسن ذوقی نے ایک نظم بہ عنوان

''خدا حافظ'' پڑھی، جس کا آخری بند یہ ہے:

وہ مثل گل نہاں رہے بہار گلستاں رہے
نسیم بوستاں رہے سرور جاوداں رہے
ہمیں بھی ان پہ ناز تھا خلوص تھا نیاز تھا
ہزار حیف اب وہ خواب ہوگئیں کہانیاں بس اب تو چشم تر ہے اور اس کی خوں فشانیاں(۶۵)

اسی سال دسمبر میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس مدراس میں ہوا تو اس کے صدر عمومی تو سر شیخ عبدالقادر ہوئے مگر اس کے ایک اہم شعبہ اصلاح وتمدن کے صدر سر شاہ سلیمان منتخب ہوئے، اس کے خطبہ صدارت میں پردے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ''پردہ کی وجہ سے بڑی بڑی برائیوں سے امن ہے، کوئی شخص جس نے مغربی تہذیب کی خرابیوں کی طرف سے آنکھیں نہ بند کرلی ہوں یا اس کو ان خرابیوں کے پوشیدہ کرنے کی غرض ہو، اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ عورتوں اور مردوں کو بے قید ملنے جلنے دیا جائے تو ضرور نقصان اور خرابیاں ہیں، مشرقی دماغ اس بے قید آزادی کا جو مغرب میں عورتوں کو حاصل ہے، اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ یہ آزادی دوسری حد کے پار جارہی ہے لیکن مغرب میں بھی صرف پادریوں کے درمیان نہیں بلکہ مدبرین میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ اصلیت محسوس کرتے ہیں کہ پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے، بس کیا تعجب ہے اگر کوئی ہندوستانی حفظ ماتقدم کرے کہ مغربی چھوت اس کی مستورات کو نہ لگے''۔(۶۶)

مگر پھر بھی وہ اس دور کے پردے کے مخالف ہیں اور وہ لکھتے ہیں ''پردے کے رواج کی سختی کو ڈھیلا کیا جائے''۔(۶۷)

اس درمیان ۱۹۲۸ء میں وہ آل انڈیا صدر ایجوکیشنل کانفرنس کے اکتالیسویں اجلاس منعقدہ یکم ستمبر کے صدر منتخب کیے گئے۔

خطبہ صدارت میں فرمایا ''تعلیم کے عام و دل کش ہونے، اسے غرباء کے طبقہ کے لیے کارآمد بنانے اور ممکن الحصول سرمایہ کو مفید مصرف میں اور کام میں لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مدرسوں میں نوعیت تعلیم وہ ہو جو طلبہ کے اسی کام یا شئی کے قابل بنا سکے جس میں انہیں آگے چل کر داخل ہونا ہے، اس لیے کہ ایک زراعت پیشہ شخص کے لڑکے کے لیے علم زراعت کی ابتدائی تعلیم

ایک مکمل ادبی تعلیم سے کہیں زیادہ کارآمد ہے، عام پرائمری اسکولوں میں دستکاری کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے، لڑکیوں کے مدارس میں تاریخ، جغرافیہ، صرف ونحو اور الجبرا کے مقابلہ میں سینے پرونے کا کام کرنے، لباس بنانے، کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور حساب کتاب کے رکھنے پر زیادہ زور توجہ صرف کرنی چاہیے، البتہ یونی ورسٹی کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ چوں کہ اس کا مقصد بلند ترین اوصاف کے افراد پیدا کرنا ہے، اس لیے وہ سب کے لیے یکساں ہونی چاہیے''۔(٦٨)

جب سرشاہ کانفرنس کے آخری دن کے اجلاس کے بعد واپس ہوئے تو سید حسین نے ایک نظم پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

الوداع اے صدر اے زینت دہ بزم سرور
آپ کے آنے سے بے شک ہوگیا سب رنج دور(٦٩)

اسی سال وہ ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیے گئے، اس کے اگلے سال نائب بنائے گئے۔(۷۰)

۳۰ء میں انہوں نے سلسلہ کلام اساتذہ اردو میں انتخاب مثنویات میر شائع کیا، اس انتخاب کا سبب خود سرشاہ کی زبان سے سنیے ''میر نے وہ زمانہ پایا تھا جب کہ اخلاقی نقطہ نظر سے فحش مضامین یا الفاظ کا اشعار میں قلم بند ہوجانا کچھ بھی معیوب نہ سمجھا جاتا تھا...... یہ مناسب خیال کیا گیا کہ اکثر اشعار اس طرح چھوڑ دیے جائیں کہ مثنوی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے اور اصل قصہ کی صورت بھی بدلی ہوئی معلوم نہ ہو، بہ قول نظامی بدایونی ''فی الواقع ایک مشکل کام تھا اور میر کی مثنویات کا یہ انتخاب اردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ سرشاہ نے میر جیسے شاعر کی مثنویات کو ایک خوش نما جامہ پہنا کر تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ایسی صورت میں پیش کردیا۔(۷۱)

اس کے مقدمہ میں میر تقی میرؔ کے حالات نہایت تحقیق وجستجو سے نقل کیے ہیں، اکثر غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتے جاتے ہیں، نموتناً اس کی ابتدائی چند سطریں اگلی قسط میں پیش کی جائیں گی۔

(باقی)

حواشی

(۱) مقدمہ بشری، ص ا، از شمس العلما مولانا محمد امین عباسی بن مولانا محمد فاروق چریا کوٹی۔(۲) میری نانی

سرشاہ کی حقیقی چچیری بہن کی لڑکی تھیں ۔(۳) یہ دیوان شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی ثم بہراوی کے حقیقی برادرزادہ وخلیفہ تھے (قلمی تذکرہ غوثیہ، مملوکہ دارالمصنّفین، ص ۱۶۱-۱۶۰)۔(۴) یہ اس مرتبہ کے تھے کہ ایک بارشاہ جہاں کے ساتھ میاں میر سیال کوٹی کے یہاں گئے ، بادشاہ نے میاں میر کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا تو میاں میر نے کہا کہ اس نذرانہ کے اصل حق دار شاہ ابوالخیر ہیں، (دیار پورب میں علم اور علما، ص ۴۳۲)، شاہ ابوالخیر ہی کی مصنفہ ''شیروشکر'' ہے جس میں غالباً سب سے پہلی بار اس خاندان کا ذکر خاص طور سے تیسرے باب میں کیا گیا ہے اور شجرہ وخاندانی حالات کے لیے یہ ایک مستند ماخذ ہے، الہ آباد میں یہ موجود ہے، اس سلسلہ میں دوسرا خاندانی ماخذ ''مناقب غوثی''، مولفہ شیخ شمس الدین مہدوی خلیفہ گرم دیوان صاحب ہے جو ۱۱۴۲ھ میں لکھی گئی جب کہ شیروشکر ۱۰۰۶ھ میں لکھی گئی تھی ۔(۵) انہوں نے ولید پور کے قریب سلطان پور عرف بھیرہ کو آباد کیا اور پھر اسی میں سکونت اختیار کرلی ۔(۶) حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانی کے سلسلہ سہروردیہ میں مرید وخلیفہ تھے، بعد میں ملتان سے دہلی آئے اور پھر تیموری حملہ ہونے پر ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں ۱۳۹۸ء میں اپنے صاحب زادہ شیخ محمد کے ساتھ جون پور آئے (تجلی نور، شنگرف اول، ص ۴۶، ۴۷)۔(۷) چنگیز خاں نے ۶۱۰ھ میں شہید کیا تھا۔ (۸) حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی وحضرت بابا فریدالدین معروف بہ گنج شکر کا شجرہ آکران ہی پر مل جاتا ہے ۔(۹) برکات الاحمدیہ الباقیہ، معروف بہ زبدۃ المقامات مولفہ خواجہ محمد ہاشم کشمش بن عبداللہ واعظ الاصغر بن عبداللہ واعظ الاکبر میں ابوالفتح دیا ہوا ہے اور یہی سید شاہ ابوالحسن زید فاروقی بن شاہ ابوالخیر مجددی فاروقی، مقامات خیر، ص ۲۹، و دیگر حضرات مولانا علی میاں (تاریخ دعوت وعزیمت، چہارم، ص ۱۲۸) وغیرہ بھی صحیح سمجھتے ہیں ۔(۱۰) شیروشکر میں ابراہیم صاحب کا نام نہیں دیا ہے بلکہ امام اسحاق ابن ناصرالدین امام سالم ہے ۔(۱۱) حضرت ابوالحسن زید فاروقی صاحب نے اپنی کتاب ''مقامات خیر'' کے صفحات ۳۰ تا ۳۳ میں بحث کرکے لکھا ہے کہ یہ ناصر بن عبداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب ہیں اور اسی پر علی میاں بھی اعتماد کرتے ہیں (تاریخ دعوت وعزیمت، ص ۱۲۷ و ۱۲۸)۔(۱۲) ملامحمود جون پوری کے رسالہ ''جبر واختیار'' کو تلاش کرکے خود ہی بہ زبان عربی مقدمہ لکھا جسے بعد میں سرشاہ سلیمان مرحوم سے لے کر علی مہدی خاں لکچرار شعبۂ فلسفہ الہ آباد یونی ورسٹی نے مع مقدمہ حافظ صاحب وپیش لفظ بہ زبان انگریزی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ۔(۱۳) ابن شیخ محمد بن شیخ محمد عرف شیخ

برائے بن مخدوم شیخ خضر بن شیخ معروف ثانی بن شیخ عثمان، مسبوق الذکر۔ (۱۴) میری نانی مرحومہ کے حقیقی نانا، ان کے بارے میں ''گلشن قلندریہ'' دیکھیں۔ (۱۵) مقدمہ دیوان فدائی، ص ۳۸۔ (۱۶) دیوان فدائی حصہ دوم (اردو)، ص ۵۱۔ (۱۷) ایضاً، حصہ اول (فارسی)، ص ۱۴۔ (۱۸) منسوب حضرت دیوان محمد رشید جون پوری۔ (۱۹) دیوان فدائی حصہ دوم (اردو)، ص ۵۴۔ (۲۰) ذکر سلیمان از عبدالحئی، ص ۶، مطبوعہ پاکستان۔ (۲۱) ریاض رضواں، ص ۷۶۵۔ (۲۲) قائم کردہ مولانا سخاوت علی جون پوری۔ (۲۳) حال راج کالج جون پور۔ (۲۴) ذکر سلیمان از عبدالحئی عباسی، ص ۵۔ (۲۵) خانقاہ رشیدیہ، جون پور۔ (۲۶) شاہ محمد عثمان فدائی۔ (۲۷) ذکر سلیمان، ص ۳۔ (۲۸) ''معارف'' اپریل ۱۹۴۱ء، ص ۲۴۲ و ۲۴۳۔ (۲۹) ذکر سلیمان، ص ۴۔ (۳۰) Centlenory High Court of Judicatre at Allahabad 1966 -Commenoration Vol.I, P.296. Sir Shah Mohd Sulaiman by Mr. Justice R.S. Pathak.، اسی سال مشہور قانون داں فضل علی نے بنارس کے کوئنس کالج سے بی ایس سی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا مگر سر شاہ نے فضل علی سے بھی ۵ نمبر زیادہ حاصل کیے تھے، اس لیے وظیفہ کے حقدار شاہ صاحب ہی ہوئے، فضل علی صاحب گھر کی امداد سے یورپ گئے، یہ بھی آئی سی ایس میں تھے اور فیل ہو گئے، فضل علی ہندوستان چلے آئے۔ (۳۱) بحوالہ خط سر شاہ سلیمان بنام والد محترم نمبر ۵۔ (۳۲) خط بنام والدہ محترمہ نمبر ۶۔ (۳۳) خط بنام والد محترم (دراصل اپنے خط میں پوری تفصیل لکھ کر گھر بھیجتے تھے حتیٰ کہ ''کتابوں کی خریداری، حجامت، دھوبی کی دھلائی کے تفصیلی حسابات والد محترم کو تحریر فرماتے رہے)، ذکر سلیمان، ص ۵۔ (۳۴) مکتوبہ ۶/ دسمبر ۱۹۰۶، یوم جمعہ۔ (۳۵) ماہنامہ برہان، اپریل ۱۹۴۱، ص ۲۴۲۔ (۳۶) یادرفتگاں، طبع پاکستان، ص ۲۵۰۔ (۳۷) ماہنامہ سائنس، نومبر ۱۹۴۱، ص ۲۸۔ (۳۸) خط بنام والد محترم۔ (۳۹) سائنس، نومبر ۱۹۴۱، ص ۲۸۔ (۴۰) ذکر سلیمان، ص ۵۔ (۴۱) برہان، اپریل ۱۹۴۱، ص ۲۴۲۔ (۴۲) خطبہ صدارت، ص ۶۔ (۴۳) تاریخ ہائی کورٹ میں ہے کہ ان کی قانون دانی میں مہارت، حکمت اور دانش مندی ان کو اس زمانہ کے دو جج سر ہنری رچرڈس (چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۲ء) اور سر گرم ووڈ میرس (چیف جسٹس ۱۹۱۹ء- ۱۹۳۲ء) کے قریب لائی اور جب کہ وہ اپنے ہم عصر لوگوں میں بہت کم عمر تھے، ان کو عدالت میں ایک معزز عہدہ دیا گیا، ج ۱، ص ۲۹۶۔ (۴۴) خطبہ صدارت۔

(۴۵) ایضاً، ص ۱۲۔ (۴۶) ایضاً۔ (۴۷) ایضاً، ص ۲۱۔ (۴۸) ایضاً، ص ۱۰۔ (۴۹) زمانہ، اپریل ۱۹۴۱، ص ۲۰۳، سرسلیمان اردو ادب کی دنیا میں۔ (۵۰) دیباچہ قصائد ذوق از سرشاہ، ص ۷ و ۸۔ (۵۱) تمہید غزلیات ذوق، ص ۳۔ (۵۲) ایضاً، ص ۲۔ (۵۳) دیباچہ قصائد ذوق، ص ا۔ (۵۴) زمانہ، اپریل ۱۹۴۱، ص ۲۰۴۔ (۵۵) ایضاً۔ (۵۶) غزلیات ذوق، ص ۸ و ۹۔ (۵۷) رسالہ معارف ''شذرات''، نومبر ۱۹۳۲ء۔ (۵۸) حیات آفتاب مصنفہ حبیب اللہ خاں، ص ۳۸۷۔ (۵۹) چند اکابر چند معاصر، ص ۵۱۔ (۶۰) ذکر سلیمان، ص ۱۱ (۶۱) برہان، اپریل ۱۹۴۱، ص ۲۴۳ و ۲۴۴۔ (۶۲) زمانہ، مارچ ۱۹۴۱، ص ۱۶۷۔ (۶۳) علی گڑھ میگزین ''شذرات''، ج ۷، نمبر ۸ تا ۱۰، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۹۔ (۶۴) سرگذشت علی گڑھ سرسید نمبر، یکم مارچ ۱۹۲۰۔ (۶۵) اصلاح تمدن، خطبہ صدارت، ص ۲۸۔ (۶۶) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، مرتبہ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر محمد ایوب قادری، ص ۳۸۲ - ۳۸۳۔ (۶۷) ایضاً، ص ۳۸۶۔ (۶۸) رسالہ ہمایوں، اپریل ۱۹۴۱، ص ۲۳۷۔ (۶۹) تاریخ شیراز ہند از سید اقبال احمد جون پوری میں ہے ''سرزمین جون پور کو یہ فخر حاصل رہا کہ بہ یک وقت تین ہستیاں ایسی تھیں جو سر کے خطاب سے سرفراز تھیں، سرشاہ سلیمان بار ایٹ لا، سر وزیر حسن بار ایٹ لا، مانی کلاں پوری اور نواب سر محمد یوسف بار ایٹ لا، ص ۸۱۶۔ (۷۰) انتخاب مثنویات میر (تمہید)، ص ا۔ (۷۱) زمانہ، اپریل ۱۹۴۱، ص ۲۰۶۔

فکر اقبالؔ پر رومیؒ کے اثرات

ڈاکٹر آفاق فاخری

مولانا جلال الدین محمد رومیؒ (۶۰۴ھ - ۶۷۲ھ) کی متصوفانہ زندگی کا آغاز شمس تبریزی کی ملاقات کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

مولانا نے ساری زندگی کسب فیض، حصول علم اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور زندگی کے شب و روز، اسلامی، دینی اور روحانی ماحول میں بسر کیے، ہمیشہ رزق حلال کے طالب رہے، عمر بھر تصوف کے نشہ میں سرشار رہے، ان پر اکثر وجد و سرور و جذب و استغراق اور بے خودی و محویت کا عالم طاری ہوجاتا، اسی وجد و انجذاب کے عالم میں انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں، رومیؒ کا عہد ایک ایسا عہد تھا جس میں انسان کا ذہن ایک نئی دنیا کی آرزو و جستجو میں سرگرداں تھا، مولانا رومیؒ کے متصوفانہ فلسفہ سے بعد میں جمود و تعطل، بے یقینی اور بے اعتمادی کی شکار روحوں کے احیاء کے لیے کافی کام لیا گیا۔

رومی کا دیوان، خطوط کا مجموعہ اور مثنوی ان کی زندۂ جاوید تصانیف تصور کی جاتی ہیں، ان میں خصوصاً مثنوی کو مقبولیت کا جو درجہ حاصل ہے وہ دیگر تصانیف کو کم ہے، مثنوی، مولانا روم کا حیرت انگیز تصنیفی کارنامہ ہے، مولانا رومی کی علمی نشو و نما اور ان کے فلسفہ علم الکلام کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب میں تحریر فرمایا ہے:

''مولانا کا علمی نشو و نما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود

اشرفیہ کالج، قصبہ ماہل، ضلع اعظم گڈھ۔

ایک کامیاب مدرس اور معقول عالم تھے، توفیق الٰہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معنی اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم ترقی کر کے حقیقت و معرفت تک پہنچے تو ان کو فلسفہ اور علم کلام کی کمزوریوں اور استدلال اور قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا اور فلاسفہ و متکلمین اور اہل استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہوگئی تو انھوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی، وہ چوں کہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں اس لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کی واقفیت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا''۔(۱)

علامہ اقبال کو مولانا رومی سے ایک مخصوص قسم کی جذباتی اور والہانہ عقیدت تھی جس کی بنیاد پر انھوں نے کبھی انھیں ''پیر رومی'' اور کبھی ''مرشد رومی'' کہہ کر مخاطب کیا ہے، فکر اقبال پر رومی کے اثرات ایک مسلم حقیقت ہے، اقبال کی نظموں، غزلوں اور مثنویوں میں رومی کے افکار و نظریات کا انعکاس ہوتا ہے، یہاں اس بات کا بھی اعتراف ضروری ہے کہ اگر فکر رومی نے اقبال کے تصورات و تفکرات پر اثر انداز ہوکر انھیں جلا بخشی ہے تو اقبال نے بھی رومی کے افکار و خیالات سے ترسیل و ابلاغ میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے جس سے رومی کی عظمت سے لوگ روشناس ہوئے۔

اقبال کے فکر و شعور میں جس انداز سے بالیدگی اور پختگی آئی اسی طرح رومی سے ان کا فکری ارتباط گہرا اور پختہ ہوا، یہاں تک کہ اقبال نے رومی کو اپنا پیر معنوی اور سفر افلاک کا رہنما متصور کرلیا، اقبال نے رومی کی شخصیت میں علم و عرفان کی روشنی دیکھی اور علم و عرفان مابعد الطبیعاتی نظام فکر اور تصوف میں متشکل ہوکر اقبال کے ذہن و دماغ میں سرایت کرگیا، زندگی کے متعلق اقبال کو اپنے تمام سوالوں کے جوابات پیر رومی سے ملتے گئے، رومی کے صوفیانہ مسلک کے اثرات ابتدا ہی سے اقبال پر ظاہر ہونے لگے، چنانچہ وہ ''بانگ درا'' کی ایک نظم ''گل پژمردہ'' میں پیر رومی کے نظریات و خیالات سے متاثر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اس نظم میں اقبال کا یہ شعر ؎

ہمچو نے از نیستان خود حکایت می کنم
بشنو از گل ! از جدائیہا شکایت می کنم

درج بالا شعر رومی کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

بشنواز نے چوں حکایت می کند و ز جدائیہا شکایت می کند

اقبال نے اسلامی اور غیر اسلامی افکار و نظریات کے عمیق مطالعہ کے بعد قرآن مجید کو اپنا رہنما، پیغمبر اسلام حضور اکرمؐ کو اپنا محبوب اور مولانا روم کو اپنا مرشد قرار دیا، اسی مثلث پر انہوں نے اپنے فکر و فلسفہ کی اساس رکھی، رومی کے فلسفہ تصوف کی جھلکیاں واضح طور پر کلام اقبال میں نظر آتی ہیں، چنانچہ ہمارے لیے رومی کے فکر و فلسفہ اور کلام و پیام کی تفہیم کے لیے رومی کے ساتھ اقبال کے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔

اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور ''بانگ درا'' کے حصہ اول میں رومی کے متصوفانہ فکر و خیال کی کارفرمائی نظر آتی ہے، یہیں پر اقبال نے وحدت الوجود کے نظریہ کو نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ پیش کیا ہے، آخری زمانے میں تصوف کے معاملے میں اقبال کی اور رومی کی راہیں الگ الگ ہوگئی تھیں، رومی وحدۃ الوجود کے قائل تھے لیکن اقبال وحدۃ الشہود کے قائل ہوگئے، جب کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی مشہور تصنیف ''سوانح مولانا روم'' میں رومی کے نظریہ وحدۃ الوجود کے متعلق تحریر فرمایا ہے:

> ''مولانا وحدۃ الوجود کے قائل تھے، ان کے نزدیک تمام عالم اس ہستی مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں، اسی بنا پر صرف ایک ذات وحدۃ الوجود ہے، یعنی ایک ذات واحد موجود ہے اور تعدد جو محسوس ہوتا ہے محض اعتباری ہوتا ہے''۔(۲)

اس متصوفانہ مسلک میں اپنی سپردگی اور گرویدگی کا کھلے لفظوں میں اقبال نے اظہار کیا ہے اور اس منزل پر رومی اور اقبال کا فکری رابطہ نہایت مضبوط ہوجاتا ہے، جب انہوں نے رومی کو اپنا رہنمائے کامل تسلیم کرلیا اور واضح طور پر اس کا اظہار بھی کیا کہ عقل و خرد میں مادیت کے غلبہ کی وجہ سے جو پیچیدگیاں اور الجھاؤ پیدا ہوگئے ہیں وہ صرف آتش رومی کے سوز سے حل کیے جاسکتے ہیں، میری نگاہ فکر اسی کے فیض سے روشن ہے اور میرے فکر و شعور کے سبو میں اسی کے دم سے بحر زخار موج زن ہے ؎

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے تیرا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ روشن ہے
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

درحقیقت اقبال کے نزدیک رومی ایک ایسے ہادی و پیشوا کی صورت میں ہیں جس کے وسیلہ سے وہ زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی میں کامیاب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، اقبال کی نظر میں مولانا جلال الدین رومی کی شخصیت کتنے زاویوں سے جلوہ گر ہے، اس کی وضاحت کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

''یہ مولانا جلال الدین رومی ہیں جو اقبال کی نظر میں حکیم بھی ہیں اور کلیم بھی، مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی، شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی، طریقت کے دشوار گذار راستوں کے راہبر بھی ہیں اور حقیقت کے مرحلوں کے ہادی بھی، شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں اور حکمت کے وقائع کے شارح بھی''۔(۳)

علامہ اقبال کو مولانا رومی سے جو عقیدت اور اُنس تھا اس کا اظہار انہوں نے متعدد جگہ کیا ہے، ''بال جبرئیل'' میں ایک جگہ انہوں نے رومی کو پیر روم کہہ کر مخاطب کیا ہے ؎

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب ، ایک کلیم سر بکف

قیام انگلستان کے دوران انہوں نے اپنی ایک نظم ''یورپ سے ایک خط'' میں فکر رومی کی طرف مائل ہونے کا اظہار کیا ہے ؎

ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار — اک بحر پر آشوب و پر اسرار ہے رومی
تو بھی ہے اس قافلۂ شوق میں اقبال — جس قافلہ شوق کا سالار ہے رومی
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام — کہتے ہیں چراغ رہ احرار ہے رومی

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور انگلستان سے واپسی کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس دور میں تصور عشق یا خودی کا تصور ان کے فکر و فلسفہ پر زیادہ غالب نظر آتا ہے، چوں کہ رومی نے اپنے افکار و نظریات سے اخلاقی نظریے کی ساکت و جامد زندگی میں تصوف کی نئی جہتوں کی نشان دہی

کی اور حسن کو عشق کا مرہون منت قرار دیا، اس کے تحت اقبال کے تصور عشق میں زیادہ تقویت پیدا ہوئی، رومی کے عشق میں بصیرت، حمیت اور خودی کو خدا میں ضم کرنے کی صلاحیت تھی، اس عشق میں ایک خاص قسم کی کیفیت تھی جس میں خدا طلبی کا جذبہ اور میلان بہ درجۂ اتم تھا اور اس عشق میں حرکت، آرزو اور آزادی کا احساس ہے جس سے انسان اپنے مقام کی شناخت بہ آسانی کرسکتا ہے، عشق کے اس سفر میں رومی نے ہی اقبال کی سچی رہنمائی کی ہے، رومی کے تصور عشق کی سچی تفسیر مولانا صلاح الدین احمد کی اس تحریر میں ملتی ہے:

''مولانا روم نے عشق کے جس تصور کو اپنے افکار، اپنے جذبات اور اپنے عقیدے، اپنی تعلیم، اپنے مذہب، اپنے مسلک، اپنے کردار اور اپنے عمل کا محور بنایا وہ انسانیت کا ایک ہمہ گیر اور دل پذیر تصور ہے''۔ (۴)

رومی کا عشق قلبی احساس و ادراک کے ارتقا سے نمو پاتا ہے اور زمان و مکان پر کمند ڈالتا ہے، چوں کہ عشق ایک آفاقی اور کائناتی قوت ہے، جس میں ارتباط و انضمام اور نمو کی صلاحیتیں موجود ہیں، رومی کے عشق میں پراسراریت، ہمہ گیریت اور تخلیقی قوت موجود ہے، اقبال نے بھی رومی کے تصور عشق کے انہیں پہلوؤں سے اتفاق کیا ہے اور رومی کے تصور عشق کی مرکزیت کو اپنی مشہور نظم ''مسجد قرطبہ'' میں انتہائی سلیقہ سے معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے ؎

عشق دم جبرئیل ، عشق دم مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم ، عشق امیر جنود — عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات — عشق ہے نور حیات، عشق ہے نارِ حیات

فکر اقبال کو رومی کے تصور عشق اور قوت عشق سے ذہنی طور پر غذا ملی جس سے فکر نو کی بنیاد پڑی، اقبال کے نزدیک عشق سے خودی میں قوت اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور عشق کے ذریعہ اقدار و نظریات کی تخلیق اور ان کی حقیقت کو اجاگر کیا جاسکتا ہے، اقبال کے تصور عشق میں نہایت وسعت اور تعمق ہے، خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے:

''اقبال نے عشق کے مفہوم میں بڑی گہرائی اور بڑی وسعت پیدا

کردی ہے، اس بارے میں وہ خاص طور پر عارف رومی کا شاگرد رشید ہے، اقبال نے حکمت وعرفان کے بیش بہا جواہر اس مرشد سے حاصل کیے ہیں لیکن عشق کے بارے میں وہ خاص طور پر رومی کا ہم آہنگ ہے"۔(۵)

اقبال کے تصور عشق کا سرچشمہ رومی کا تصور عشق ہے، اقبال کی شاعری میں تصور عشق کا انعکاس کثرت سے ملتا ہے وہ عشق کا ایک ہمہ گیر اور جامع تصور رکھتے تھے، دونوں کے تصور عشق کے متعلق پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

"رومی اور اقبال دونوں کے لیے عشق ایک آفاقی (Cosmic) جذبہ ہے جس کا سرچشمہ انائے لامحدود (Infinit Ego) ہے اور یہ لامحدود انا، ذی روح ذرات (Monads) کی اس کائنات میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے"۔(۶)

اقبال نے عقل وعشق کے ذیل میں جو کچھ بھی قلم بند کیا ہے وہ بنیادی طور پر فکر رومی کا رہین منت ہے، رومی عقل وعشق کے رمز شناس تھے، انہوں نے عقل طبعی کے مقابلہ میں جذبۂ عشق کی استواری پر زور دیا ہے، اقبال نے بھی اس کی تاکید کی ہے، رومی اور اقبال کے وجدان اور بصیرت میں کافی حد تک مماثلت کا احساس ہوتا ہے، رومی کے فلسفہ میں جو اسلامی اور روحانی قوت تھی، اس بعض پہلوؤں سے ان کا نظریہ ارتقا یا ایمان بالارتقا واضح طور پر سامنے آ گیا اور آج بھی مغربی مفکرین اس نظریہ ارتقا کو اپنا پیش رو تصور کرتے ہیں۔

اقبال اور رومی میں بہت سے نظریات مشترک ہیں، رومی کے نظریۂ حیات میں مادے سے لے کر خدا تک زندگی کا تصور ہے، البتہ ان کے مدارج الگ الگ ہیں اور ان مدارج میں عقل کی کارفرمائی ہے، اسی باعث رومی کے یہاں عقل جمادی، عقل نباتی، عقل انسانی اور عقل نبوی کے مدارج کا تذکرہ ملتا ہے، اقبال کے یہاں عقل کا تصور رومی کے ہی عقل کے تفکرات ونظریات سے آیا ہے، اقبال کا نظریۂ خودی جوان کے فکر وفن پر غالب ہے، رومی کے ہی تصور خودی سے ماخوذ ہے کیوں کہ رومی بھی خودی کا استحکام چاہتے ہیں، دونوں عشق اور خودی کو زندگی کا اصل تصور کرتے ہیں، اقبال نے رومی کے فلسفہ اور نظریات کی تدوین وتشریح اور دور جدید میں اس کی اہمیت وافادیت پر زور دیا ہے، چنانچہ "ضرب کلیم" کی ایک مختصر سی نظم بہ عنوان "رومی" ملاحظہ کیجیے:

غلط نگہ ہے تری چشم نیم باز اب تک ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
شکستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

اقبال کو رومی سے ایک جذباتی عقیدت، روحانی قربت اور قلبی محبت تھی، ''بال جبرئیل'' کی ایک مشہور نظم ''پیر و مرید'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ رومی نے اقبال کی فکری پیچیدگیوں کو سلجھایا ہے اور زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں ان کی کافی رہنمائی کی ہے، فکر اقبال کا اہم ترین سرچشمہ فلسفہ رومی ہے، نظم ''پیر و مرید'' کے چند اقتباس پیش ہیں جس سے اقبال اور رومی کی ذہنی و فکری ہم رنگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(مرید ہندی)

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

(پیر رومی)

علم را برتن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

(مرید ہندی)

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد کھول مجھ پر نکتۂ حکم جہاد

(پیر رومی)

نقش حق را ہم بہ امر حق شکن بَر زجاج دوست سنگ و دست زن

(مرید ہندی)

سرّ آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرے سے مہر و ماہ کر

(پیر رومی)

ظاہرش را پشہ آرد بچرخ باطنش آمد محیط ہفت چرخ

(مرید ہندی)

خاک تیرے نور سے روشن بصر غایت آدم خبر ہے یا نظر

(پیر رومی)

آدمی دید است باقی پوست است دید آں باشد کہ دید دوست است

(مرید ہندی)

اب مسلمان میں نہیں وہ رنگ و بو سرد کیوں کر ہوگیا اس کا لہو

(پیرِ رومی)

تا دل صاحب دلے نامد بہ درد ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

(مرید ہندی)

تجھ پہ روشن ہے ضمیر کائنات کس طرح محکم ہو ملت کی حیات

اقبال کو مولانا رومی سے ایک سچی عقیدت اور محبت تھی جو زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہی، اقبال اپنے عہد کے مادیت زدہ ماحول سے عالم انسانیت کو نجات دلانے کے لیے ہمیشہ رومی کے منتظر رہے اور اس پر زور دیا کہ انسانی ذہن وفکر کے جمود و تعطل کے لیے آتش رومی کی سخت ضرورت ہے، اسی لیے انہوں نے بال جبرئیل میں ایک جگہ رومی کے انتظار میں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

آخر میں افکار رومی اور اقبال کی ذہنی وفکری مماثلت کے تناظر میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی یہ تحریر پیش ہے ''البتہ یہ امر مسلم ہے کہ اقبال کو رسول کریمؐ کے بعد سب سے زیادہ عقیدت مولانا روم سے ہے''۔(۷)

حواشی

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ اول)، ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوہ لکھنؤ، ۱۹۷۹ء، ص ۳۶۲۔(۲) سوانح مولانا روم، علامہ شبلی نعمانی، نامی پریس، کان پور، ۱۹۰۶ء، ص ۱۸۲۔(۳) مقامات اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ، چمن بک ڈپو، اردو بازار دہلی نمبر ۶، ص ۲۸۲۔(۴) تصورات اقبال، مولانا صلاح الدین احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص ۳۲۹۔(۵) فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص ۲۱۶۔(۶) نقش اقبال، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۱۔(۷) ایضاً، ص ۸۹۔

اخبار علمیہ

موجودہ عالمی صورت حال نے اسلام کے بارے میں دل چسپی اور تشویش دونوں ہی کو بڑھا دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض مثبت فکر کے حامل افراد اور اداروں نے اسلام اور اسلامی دنیا سے متعلق فن پاروں کی نمائش کو بہ طور خاص اپنی دل چسپی کا موضوع بنالیا ہے اور دنیا بھر کے عجائب گھروں میں اسلامی نوادرات کی نمائش ہورہی ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی لندن میں دریائے ٹیمز کے کنارے بنے ہوئے سمرسیٹ ہاؤس کی نمائش بھی ہے، جس میں اسلامی فن پاروں کو نمایاں طور پر اہمیت دی گئی ہے، اس نمائش کا نام ''ہیون آن اَرتھ، آرٹ فرام اسلامک لینڈز'' رکھا گیا ہے، یہ فن پارے یا تو اللہ کی بندگی کے اظہار کے لیے یا پھر بادشاہوں کی خوش نودی کے لیے وجود میں لائے گئے تھے، ان نوادر کو دی اسٹیٹ ہیرٹیج میوزیم، سینٹ پٹرز برگ اور خلیلی کلکشن لندن سے حاصل کیا گیا تھا، نمائش میں کل ۱۳۰/فن پارے رکھے گئے ہیں جن میں غلاف کعبہ کی اوپری پٹی، خط کوفی میں مرقوم قرآن مجید کا ایک ورق، آب زر سے لکھا گیا دکن کا نسخۂ قرآن، ممالک اسلامیہ میں بنائے گئے دیدہ زیب برتن، دھات سے بنی ہوئی قدیم مصنوعات، ملبوسات، تصویریں وغیرہ ہیں، ان کے علاوہ ہرات کے ایک تاجر کی منقش بالٹی، جواہرات اور موتیوں سے مرصع وہ برتن جو نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کے وقت مغلوں سے لوٹے اور پھر تحفہ میں روس کی ملکہ کو بھجوائے مگر ملکہ کے انتقال کے سبب اس تک نہیں پہنچ سکے، بہ طور خاص دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز ہیں، یہ نمائش اگست ۲۰۰۹ء تک جاری رہے گی، اب تک اس نمائش میں پندرہ ہزار سے زیادہ لوگ آچکے ہیں اور وہ اسلامیات پر مشتمل کتابیں اور قرآن مجید کے انگریزی ترجمے بھی بڑے جذبے سے خریدتے ہیں۔

پرویز شاہین افغانستان کے صوبہ سوات کے صدر مقام مینگورہ سے سات کلومیٹر دور مینگلور کے رہنے والے ہیں، ان کا شمار پشتو کے ممتاز ادیبوں اور گندھارا آرٹ اور لسانیات کے ماہرین میں ہوتا ہے، پشتو میں انہوں نے تیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، ان کی اصل پہچان ان کا

کتب خانہ ہے، جس میں انہوں نے طب، سیاست، گندھارا تہذیب وتمدن اور دوسرے اسلامی موضوعات پر مشتمل ۲۶ ہزار سے زیادہ کتابیں اکٹھا کر رکھی ہیں اور بعض ایسی نادر و کمیاب چیزیں ان کی اس لائبریری میں ہیں، جن کی وجہ سے دنیا کے مختلف خطوں کے محققین یہاں پہنچتے ہیں، ۱۹۶۴ء کے بعد دنیا کے بڑے سیاسی اور قدرتی آفات و واقعات سے متعلق اخبارات و رسائل کی جلدیں بہ طور خاص محفوظ رکھی گئی ہیں، اس کتب خانہ کو موجودہ شکل دینے میں انہوں نے چالیس برس صرف کیے ہیں، لیکن طالبان اور سیکورٹی فورسیز کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کے سبب محققین کا اس مرکز علم وفن سے استفادہ بہت حد تک کم بلکہ نہیں کے برابر ہو گیا ہے، اب یہ خدشہ ہمہ وقت لگا رہتا ہے کہ یہ ذخیرہ کہیں شعلوں کی زد میں خاکستر نہ ہو جائے۔

ایرک شلوشر کی کتاب ''فاسٹ فوڈ نیشن'' میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ ۱۹۶۳ء سے اب تک امریکا میں پندرہ لاکھ بچے (E Coli Bug) بیماری سے متاثر ہو چکے ہیں، یہ ایک وائرس ہے جو جراثیم سے متاثرہ گوشت میں پایا جاتا ہے، مصنف کے بیان کے مطابق اگر والدین کو علم ہو جائے کہ برگر اور ہوٹلوں میں فاسٹ فوڈ کے طور پر کیا کچھ کھلایا جاتا ہے تو وہ ان ہوٹلوں کا رخ شاید ہی کر سکیں، کتاب کے مطابق ۱۹۹۷ء میں امریکا میں مویشیوں یعنی پالتو جانوروں کے چارے میں مردہ بلیوں اور کتوں کے گوشت کا قیمہ شامل کرنے پر قانوناً کوئی پابندی نہیں تھی مگر اب اس پر پابندی ہے، مصنف کے مطابق امریکا اور برطانیہ میں گوشت کی بڑی مقدار ان ہی مردار جانوروں سے حاصل کی جاتی ہے جن کی خوراک مردہ گھوڑے اور خنازیر ہیں اور پھر ہوٹلوں میں ان ہی جانوروں کے گوشت فاسٹ فوڈ کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، جس کے سبب یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے، اس انکشاف نے فاسٹ فوڈ استعمال کرنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے، مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ امریکا اور برطانیہ نے مردہ بلیوں اور کتوں کے گوشت مویشیوں کے چارے کے طور پر استعمال کرنے پر پابندی تو ہے لیکن یہ پابندی مردہ گھوڑوں اور خنزیر کے گوشت پر نہیں ہے۔

اسلامی بینک کاری کے موضوع پر سعودی ریسرچ اینڈ مارکیٹنگ گروپ (SMRG) نے

سعودیہ سے پہلی بار عربی زبان میں ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا اعلان کیا ہے، اس کے مدیر خصوصی عبدالوہاب الفیض ہوں گے، اس کے علاوہ متعدد جدید موضوعات پر مزید آٹھ رسالے نکالنے کا ارادہ بھی ہے، سیاسی تعلقات کے موضوع پر ''المجلّہ'' کے نام سے بھی ادارہ ماہانہ رسالہ شائع کرے گا، اس کے ایڈیٹر عادل الطریفی ہوں گے، ''الاقتصادیہ'' کے نام سے تجارت کے موضوع پر روزنامہ بھی شائع ہوگا، اس ادارہ کے چیئر مین شہزادہ فیصل ہیں، انہوں نے کہا کہ ہم اسلامی بینک کاری یعنی بلاسودی کاروبار کو پورے عالم میں بڑے پیانے پر فروغ دینا چاہتے ہیں۔

ریاست بڑودہ کے مہاراجہ گائیکواڑ کانڈے راؤنے ۱۸۶۰ء میں رسول اللہ ﷺ کے روضۂ مبارک کے لیے سرخ اور نیلے رنگ کا ایک قالین تیار کرایا تھا لیکن مہاراجہ کے انتقال کے باعث وہ مدینہ نہیں بھیجا جا سکا اور ہندوستان ہی میں رہا، ۱۰۰ برس قبل دلی میں اس کی نمائش بھی کی گئی تھی، اس کے بعد اس کو مہاراجہ کے اہل خاندان مونا کو لے گئے تھے، اس کو ''موتیوں کا قالین'' بھی کہا جاتا ہے، اس پر گلاب اور دوسرے پھولوں کی شکل کی آرائش ہیرے، نیلم، یاقوت، زمرد اور دوسرے ایسے بیش قیمت قدرتی موتیوں سے کی گئی ہے، جن کو خلیج کے سمندر سے مہاراجہ نے حاصل کیا تھا، ڈیڑھ سو برس قبل تیار کردہ اس دیدہ زیب قالین کو قطر کے دارالحکومت دوحہ میں خریداروں کے سامنے پیش کیا گیا، جسے ایک نامعلوم عقیدت مند نے ۵۸ ہزار ڈالر میں خرید لیا ہے، اس قالین کے ذکر نے ہندو راجاؤں کی رسول اللہ سے محبت وعقیدت کی قابل تقلید مثال کی یاد دلادی۔

عرب اخبار ''الحیات'' کے مطابق مکہ میں قریباً تین سو مساجد ایسی ہیں جن کی سمت قبلہ کے درست ہونے پر اطمینان نہیں ہے، ان میں زیادہ تر مسجدیں قدیم ہیں اور اب مکہ میں جدید دور کی فلک بوس عمارتوں کی تعمیر کے دوران دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ان مسجدوں کا رخ مکمل طور پر کعبہ کی جانب نہیں ہے، اس انکشاف کے بعد قبلہ کی درستگی کے لیے جدید ٹیکنک یعنی لیزر شعاع سے مدد لینے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے۔

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ گجرات (فارسی)

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

تاریخ گجرات (فارسی): مصنف شاہ ابوتراب ولی، مترجم پروفیسر شبیہ احمد،
صفحات: ۱۲۴، قیمت مجلد: ۷۰ / روپے، ناشر: گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی، تیسری منزل،
اولڈ اسمبلی بھون، نزد ٹاؤن ہال، سیکٹر نمبر ۱۷، گاندھی نگر، ۳۸۲۰۱۷۔(گجرات)

گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی نے گجرات کی تاریخ پر تین کتابوں کے ترجمے شائع کیے ہیں:
۱- مرأۃ سکندری مصنفہ سکندر ابن محمد منجھو ابن اکبر، ترجمہ از پروفیسر مرتاض حسین قریشی، ۲- تاریخ اولیائے گجرات، علی محمد خاں کی مرأۃ احمدی کے آخری حصہ کا اردو ترجمہ از مولوی ابوظفر ندوی، ۳- تاریخ گجرات مصنفہ شاہ ابوتراب ولی، ترجمہ از پروفیسر شبیہ احمد، مرأۃ احمدی کی پوری کتاب کے ترجمہ کا اعلان اکیڈمی کی فہرست مطبوعات میں موجود ہے لیکن دست یاب نہ ہونے کی وجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی ابوظفر مرحوم پوری کتاب کا ترجمہ نہیں کر سکے تھے، تاریخ اولیائے گجرات پر خاکسار کا مفصل تبصرہ دسمبر ۲۰۰۸ء کے ''معارف'' (اعظم گڈھ) میں شائع ہو چکا ہے۔

شاہ ابوتراب ولی کی تاریخ مذکورہ فہرست میں متقدم ہونے کے علاوہ مختصر ترین ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں عہد ہمایونی کے اواخر اور عہد اکبری کے اوائل کے گجرات کے احوال کا ہی احاطہ کیا گیا ہے، جس میں مصنف نے سلاطین گجرات اور مغلوں کے مابین جنگوں میں اپنے کردار کا ذکر کیا ہے اور جن میں بالآخر مغلوں کو فتح حاصل ہوئی تھی، ان فتوحات میں شاہ ابوتراب ولی کے مشوروں اور ان کی تدبیروں کا بڑا ہاتھ تھا، اس تاریخ کی حیثیت اصلاً مصنف کی ایک خودنوشت یادداشت (memoirs) کی ہے، اسے مصنف کی خودنوشت سوانح حیات (autobiography) کا

B-104، بدر منزل، پٹیل نگر، وی پی ناکہ، بھیونڈی (تھانے) ۴۲۱۳۰۲۔

نام اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ اس کا آغاز ۹۳۲ھ (مطابق ۱۵۲۵ء) میں اچانک مرزا محمد زماں کے ہمایوں کے دربار سے فرار ہوکر سلطان مالوہ باز بہادر کے پاس فتح مالوہ کے موقع پر پناہ لینے سے ہوتا ہے اور اکبر کے فتح احمد آباد کی تاریخ پر اچانک ختم ہوجاتا ہے، سرڈینی سن راس نے بھی فارسی مخطوطہ کی اولین اشاعت ۱۹۰۹ء کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''کتاب بے ربطی کے ساتھ بغیر کسی مقدمہ کے شروع ہوتی ہے'' بہرحال اس کتاب کی اہمیت دراصل ایک خاص دور کے اہم اور معتبر تاریخی ماخذ کی ہے۔

زیر تبصرہ ''تاریخ گجرات'' میں ایک مفصل دیباچہ، ڈاکٹر ڈینی سن راس کا ایک مختصر مقدمہ اور پروفیسر جمال الدین شیخ کی تحریر کردہ شاہ ابوتراب ولی کی ایک مختصر سوانح ہے جس میں ان کے خاندان کے شیراز سے چانپانیر کی آمد اور پھر ولی کے احمد آباد منتقل ہونے کی پوری تاریخ بیان کی گئی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ''آپ کا اسم گرامی حبیب اللہ ابوتراب ولی اور لقب رفیع الدین تھا'' وہ سادات حسنی، حسینی، عریضی نوربخشی میں سے تھے، گجرات کی عربی تاریخ ''ظفر والہ بن مظفر والہ'' کے مصنف حاجی دبیر نے اپنی تاریخ میں ان کو مولانا، عالی جناب، شاہ ابوتراب، الجناب الرفیع جیسے القاب واعزاز سے نوازا ہے، ان تعارف ناموں سے شاہ ابوتراب ولی کے مقام ومرتبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کا فارسی اڈیشن جو برٹش میوزیم کے ایک مخطوطہ پر مبنی تھا، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے زیر اہتمام سرڈینیسن راس نے اپنے دیباچے کے ساتھ ۱۹۰۹ء میں شائع کیا تھا، جس کا اردو ترجمہ الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبہ فارسی کے پروفیسر شبیہ احمد نے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ الہ آباد سے شائع کیا، اگرچہ انہوں نے اپنے مقدمہ میں تاریخ تحریر کا ذکر نہیں کیا لیکن پروفیسر جمال الدین شیخ نے اپنے پیش لفظ میں الہ آباد اڈیشن کی تاریخ اشاعت ۱۹۴۵ء درج کی ہے۔

گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی نے اس کی پہلی تاریخ اشاعت ۲۰۰۱ء لکھی ہے لیکن یہ بات قابل قبول اس لیے نہیں ہے کہ اکیڈمی نے کہیں یہ بات نہیں تحریر کی کہ پروفیسر شبیہ احمد کا یہ ترجمہ انہیں کہاں سے دست یاب ہوا، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد عرصہ تک الہ آباد کتابت و طباعت کا مرکز رہ چکا تھا، حکیم احمد حسین کا ''تاریخ ابن خلدون'' کا اردو ترجمہ اور ڈاکٹر زبید احمد کی

''ادب العرب'' جیسی موقر کتابیں یونانی دواخانہ پریس الہ آباد سے شائع ہوچکی تھیں، پروفیسر شبیہ احمد اس وقت الہ آباد یونی ورسٹی میں شعبہ عربی و فارسی میں استاد تھے، اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ترجمہ بھی پہلی بار الہ آباد ہی سے شائع ہوا ہے، موجودہ ناشرین کو اس بات کی صراحت کرنی ضروری تھی تا کہ کتاب اسناداً محفوظ متصور ہوتی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس تاریخ کی حیثیت صرف ایک یادداشت کی ہے جس میں اعیان و اکابر اور اساطین امراء وارکان حکومت کے اتنے افراد کے نام آتے ہیں کہ بائبل کے عہد نامۂ عتیق کے اسفار تاریخ (Chronocles) اور اعداد (Numbers) کا گمان ہوتا ہے جن کے ناموں کا یاد رکھنا تو دور کی بات ہے پڑھ لینا بھی بہت بڑی نیکی اور سعادت ہے، شاہ ابوتراب نے اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی پوری زندگی مغلوں کی وفاداری میں بسر ہوئی، خاندان مغلیہ کے دو حکمرانوں ہمایوں اور اکبر کی خدمت کی، مالوہ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے صوبوں پر مغلوں کو قبضہ دلانے میں ان کی تدبیروں کا بڑا ہاتھ تھا، یہ پوری کتاب ان صوبوں کے بہت سے شہروں اور قلعوں پر تسلط کے لیے مختلف صوبے داروں کے درمیان جنگ و جدال اور بالآخر مغل حکمرانوں کے ذریعہ ان کے مغلوب و مفتوح ہونے کی تفصیلات سے پر ہے، اس داستان میں عبرت اور موعظت کے بھی بہت سے پہلو ہیں، سب سے زیادہ باعث عبرت یہ بات ہے کہ اس زمانہ کے ہندوستان کے حکمراں (جو اتفاق سے مسلمان تھے) اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ یورپ میں علمی، فکری، صنعتی اور سیاسی انقلاب آچکا ہے اور وہاں کے اقوام کی استحصالی اور استبدادی نگاہیں مشرق کی طرف لگی ہوئی ہیں، انہوں نے جہاز رانی عربوں سے سیکھی لیکن اس صنعت کو ترقی دے کر وہ مشرق اقصیٰ تک پہنچ گئے لیکن یہاں کے حکمرانوں کو بحری بیڑا بنانے کا خیال تک نہیں آیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہادر شاہ نے جس نے محمد زماں مرزا کو پناہ دے کر ہمایوں کی ناراضگی مول لی تھی، جب اپنے کو کمزور پایا تو خود کو پرتگیزوں کی پناہ میں دے دیا اور ان دغا بازوں کے وعدہ پر اعتبار کر کے دیو کے جزیرہ کی طرف روانہ ہوا لیکن پرتگیزوں نے اپنی روایتی بدعہدی اور مسلم دشمنی کی وجہ سے اسے راستہ ہی میں غرق سمندر کر دیا، شاہ ابوتراب کی اس داستان سے ہمایوں کے عفوودرگزر اور باہمی جنگوں میں مسلمانوں کے جانی نقصانات سے متاثر ہونے کا ثبوت ملتا ہے،

چنانچہ وہ بار بار علماء سے استفتا کرتا ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے کسی خاص موقع پر دشمن کے خروج یا ان سے قتال میں سے کون سا رویہ قابل ترجیح یا قابل برداشت ہے؟ ہمایوں کے بہادر شاہ کے نام ایک خط کا یہ جملہ قابل غور ہے ''تم دو مرد عادل دین و دنیا کے بزرگ گواہ رہو کہ میں نے اسلام کی رعایت حتی الامکان کی اور میں جنگ پر راضی نہیں ہوں اور غصہ ور لڑنے پر تیار ہے''۔

شاہ ابوتراب ولی نے اکبر کی سیرت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ تاریخ میں محفوظ اور فیضی و ابوالفضل کی تحریروں میں مسطور نقشہ سے بالکل مغایر ہے، مصنف نے لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ سے جب وہ رسول کریم ﷺ کا قدم شریف لے کر آئے تو بادشاہ (اکبر) نے فتح پور (سیکری) کے باہر رک کر انتظار کرنے کو کہا اور خود اپنے کندھے پر اٹھا کر مسجد شیخ سلیم چشتی کے پائیں گجرات محل میں رکھا، جسے بعد میں مصنف نے شاہی اجازت سے احمد آباد کے محلّہ اساول میں ایک خصوصی تعمیر کردہ عمارت میں جو موجودہ محلّہ جمال پور میں کیلیکو مل کے باہر ہے رکھا، بعد کی روایات کے مطابق یہ قدم مبارک اور دیگر تبرکات اس علاقہ کے غیر محفوظ ہو جانے کی وجہ سے شہر کے اندر ایک محفوظ جگہ منتقل کر دیے گئے، سر ڈینی سن راس نے فارسی مخطوطہ کے دیباچہ میں مآثر الامراء کا بیان نقل کیا ہے کہ اس وقت اکبر اسلام کا مخالف خیال کیا جاتا تھا اور (وہ) خود نبوت کا دعویٰ کرتا تھا اور پتھر (قدم شریف) کے ساتھ اظہار عقیدت کا اس کے سوا کچھ اور مطلب نہ تھا کہ عام لوگوں کی حرف گیری کو ٹھنڈا کیا جائے، ابوالفضل بھی اس تمام واقعے کی تاویل اکبر کی طرف سے ایک مذہبی ڈرامے سے زیادہ نہیں کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''بادشاہ کا اصلی مقصد اس پتھر کو اظہار عقیدت کے ساتھ لانے اور خوش آمدید کہنے کا سوا اور کچھ نہ تھا کہ ابوتراب کی عزت افزائی کرے''۔

شاہ ابوتراب ولی کے علم اور خدا ترسی کا اندازہ ان کی نگارش سے یوں ہوتا ہے کہ وہ ہر واقعہ کی توجیہ قرآن کی آیات اور احادیث سے کرتے ہیں، انہوں نے ہمایوں کے لیے ''خلیفۂ برحق'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

اس تاریخ کے درج ذیل نکات قارئین کے لیے قابل توجہ ہیں:

۱-مصنف نے ہمایوں کے بہادر شاہ کو لکھے گئے خطوط اور ان کے جوابات کو بعینہٖ درج کتاب کیا ہے، جس میں دونوں نے اپنے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث

سے دلائل دیے ہیں، اس سے اس زمانہ کے بادشاہوں کے دینی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے، اسی سلسلہ کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ہمایوں جب بہادر شاہ کی سرکوبی کے لیے سارنگ پور پہنچا تو اس وقت بہادر شاہ چتوڑ کے مہاراجہ کے ساتھ مصروف معرکہ تھا، ہمایوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس وقت تک توقف کیا جب تک بہادر شاہ نے چتوڑ کا قلعہ فتح نہیں کرلیا، اہل علم اس بات سے بہ خوبی باخبر ہیں کہ تیمور نے عثمانی خلیفہ سلطان بایزید یلدرم پر اس وقت چڑھائی کی تھی جب وہ یورپ میں آسٹریا کو فتح کرنے کے لیے پابہ رکاب تھا لیکن تیمور کے ہاتھوں بایزید کی شکست نے مسلمانوں کے ہاتھ سے یہ موقع چھین لیا، یہ بات بڑی عبرت انگیز ہے کہ تیمور نے سلطان بایزید یلدرم (یلدرم بہ معنی بجلی) کو شکست دینے کے بعد انتہائی اہانت آمیز طریقہ سے ایک آہنی پنجرے میں محبوس کیا تھا اور جہاں بھی جاتا تھا یہ پنجرہ ساتھ لے جاتا تھا، یہاں تک کہ یلدرم کی موت اسی پنجرہ میں واقع ہوئی۔

مصنف کے بیان کے مطابق ہمایوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ مسلمانوں کا جانی نقصان کم سے کم ہو، اسی زمانہ میں خداوند خاں نام کے ایک اسّی سالہ بزرگ محدث تھے، جن کی قدردانی شیر شاہ، بہادر شاہ اور ہمایوں تینوں نے کی تھی۔

۲- مصنف نے خلجی بادشاہوں کے قبرستان ''موسومہ'' کی نشان دہی کی ہے کہ وہ مانڈو میں سہ بازار دروازہ کے باہر ہے۔

۳- سوری افغانوں سے دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے بعد ہمایوں کا طالع بلند تھا، چنانچہ اس کا جس طرف رخ ہوتا تھا وہاں کے اکثر حاکم اس کے مطیع فرمان ہوجاتے تھے، چانپانیر کا قلعہ بے انتہا مضبوط اور ناقابل تسخیر تھا، چنانچہ مصنف کے بیان کے مطابق جنگل کی طرف سیدھی دیوار میں میخیں گاڑ کر شاہی فوج اندر داخل ہوگئی اور قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

۴- مصنف کے بیان کے مطابق ہمایوں اور بہادر شاہ کی چپقلش عرصہ تک جاری رہی، بہادر شاہ واقعی بہادر تھا، سقوط مانڈو کے بعد اس نے ایک بار پھر اس پر قبضہ کرلیا تھا، اگرچہ مختلف ادوار میں مسلم حکمرانوں کا پایہ تخت نہروالہ پٹن، چانپانیر، کھمبایت اور احمد آباد رہے ہیں لیکن احمد آباد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے، چنانچہ احمد آباد پر ہمایوں کے قبضہ کے بعد ہی بہادر شاہ نے

پرتگیزوں سے استبداد کی تھی اور انہیں رشوت دے کر اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا تھا لیکن ان عہد فروشوں اور غداروں نے دھوکہ سے بہادر شاہ کو قتل کر دیا۔

۵ - مصنف کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات کے امرا شاہی تخت کے لیے شاہی خاندان ہی کے کسی شخص کو منتخب کرتے رہے ہیں تاکہ ان کی نسل برقرار رہے، حفاظت کی غرض سے ایک مرتبہ سید جی طیب نامی ایک شخص کے پاس شاہی خزانہ رکھوایا گیا لیکن اس بے ایمان نے خیانت کی اور پورا خزانہ ہضم کر لیا۔

۶ - ۹۶۲ھ میں جب ہمایوں کا انتقال ہوا تو اس کے لیے احمد آباد کی جامع مسجد میں قرآن خوانی ہوئی، اس وقت ایک بزرگ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ہندوستان مغلوں کے پاس نہ رہے گا لیکن یہ پیشین گوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی بلکہ اکبر کے عہد حکومت میں کھمبائت، بڑودہ اور سورت وغیرہ پر مغلوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔

۷ - مصنف نے سورت کے قلعہ کی مضبوطی کا سبب یہ بتلایا ہے کہ اس کی دیواروں کی تعمیر میں نرم پتھر استعمال کیا گیا تھا جس کی وجہ سے گولہ اس میں دھنس جاتا تھا اور دیوار نقصان سے محفوظ رہتی تھی، شہنشاہ اکبر نے غالباً اسی طرز تعمیر سے متاثر ہو کر الہ آباد کے قلعہ کی فصیل سہ طبقاتی بنائی پتھر کی دو ضخیم دیواروں کے درمیان ایک دیوار مٹی کی بھی تھی، اس کا پتہ دریائے جمنا میں مسلسل طغیانیوں کے سبب جنوبی سمت کی بیرونی دیوار کے گر جانے پر ہوا، کالنجر کے قلعہ کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ اس کی دیواریں مٹی کی تھیں جس کی وجہ سے ان پر گولہ باری کا اثر نہیں ہوتا تھا، شیر شاہ سوری نے اگرچہ یہ قلعہ فتح کر لیا تھا لیکن بارود کے ذخیرہ میں آگ لگ جانے کی وجہ سے وہیں اس کی موت ہو گئی تھی، ورنہ ہمایوں کا دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کر لینا ممکن نہ ہوتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ کتاب اس قدر محدود ہے کہ اسے صرف یادداشت ہی سے موسوم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے مترجم پروفیسر شبیہ احمد صاحب نے اپنے تیرہ صفحات کے مقدمہ میں مصنف سے قبل کی پوری تاریخ بیان کر کے اسے تاریخ میں تبدیل کر دیا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے پندرہویں صدی کے ایک نامور بادشاہ محمود بیگرہ کے عہد کے گجرات کا نقشہ بھی شامل کتاب کیا ہے جس سے مقامات کا محل وقوع سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے، اس نقشہ میں اگرچہ مقامات کی صحیح

نشان دہی ہے لیکن چانپانیر جو سلطان محمود بیگڑہ کا دارالخلافہ تھا، کا محل وقوع صحیح نہیں دکھلایا گیا ہے، گجرات کی تاریخ کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے اس مقدمہ کا ذکر اور اس کی ستائش نہ کرنا کتاب اور اس کے مترجم کے حق میں ناانصافی ہوگی، مترجم نے خود لکھا ہے کہ ''ابوتراب ولی کی ''تاریخ گجرات'' جس کا ترجمہ ناظرین کے پیش نظر ہے سلطنت گجرات کے ایک خاص دور یعنی بہادر شاہی سلطنت اور مابعد سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس دور کے گرد و پیش کو سمجھیں'' مترجم مزید لکھتے ہیں کہ ''اسلامی فتح گجرات سے ماقبل کی تاریخ جو تقریباً پندرہ صدیوں پر محیط ہے، ایک ''داستان پارینہ'' ہے''، انھوں نے بتلایا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں چندر گپت موریہ اور اس کے جانشین گجرات پر قابض تھے، اس کے بعد ولابھی اور چاودہ کے سلاطین کا قبضہ رہا لیکن اس دور کی تاریخ صرف سکوں اور کتبوں سے ماخوذ ہے، دسویں صدی میں چالوکیہ یا سولانکی اور واگھیلا سلاطین گجرات کے فرماں روا ہوئے، اس وقت کے تاریخی قصے اور کوہ گرنار میں اشوک اور دورادمن کے کتبے نیز سمدر گپت کا کتبہ مختلف مورخین کی تحقیق کا مصدر رہے ہیں۔

مترجم نے گجرات کے تسمیہ کو گرجستان (موجودہ کرغستان یا کرغیزیہ) سے منسوب کیا ہے، اسی لیے یہاں کی زبان کو بھی گوجری کہا گیا ہے، ولابھی خاندان نے تقریباً ۱۷۶/سال (۵۵۸ء تا ۷۳۴ء) حکومت کی، ان کا پایہ تخت نادود تھا (مصنف مرأۃ احمدی نے نادوت لکھا ہے)، اس کے بعد چاودہ اور چالوکیہ خاندان آٹھویں سے تیرہویں صدی تک حکمراں رہا، ان کا دارالخلافہ نہروالہ پٹن (انہلواڑہ) تھا، اس زمانہ میں اس خطہ کو گوجرتا کہا جاتا تھا جو مرور زمانہ سے بعد میں گجرات ہوگیا، چالوکیہ یا سولنکی خاندان نے ۹۴۲ء تا ۱۲۴۶ء تک حکومت کی ہے، اس عہد میں بھیم دیواول (۱۰۲۲ء تا ۱۰۶۴ء) کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اسی کے زمانہ میں محمود غزنوی نے سومناتھ کو فتح کیا تھا، مترجم کے نزدیک ۱۰۲۹ء میں محمود غزنوی کا ملتان اور راجپوتانہ کے ریگستانوں (جسے موجودہ جغرافیہ میں تھار کا ریگستان کہا جاتا ہے) کو عبور کر کے گجرات میں داخل ہوجانا ایک حیرت ناک کارنامہ ہے، مبصر کے نزدیک محمود کا واپسی میں خلیج کچھ اور ریگستان کو عبور کر کے واپس جانا بھی ایک معجزہ سے کم نہیں ہے لیکن مترجم کے نزدیک محمود صرف نام و نمود اور شہرت پر فریفتہ تھا، اس کے حملوں میں مذہبی جوش و خروش دراصل فوج کو

اکسانے اور ہمت دلانے کا ایک بہانہ تھا ورنہ ہندو سردار اس کی فوج کے رکن نہ ہوتے، مبصر کے نزدیک مترجم کے تجزیہ میں تضاد صاف طور سے نمایاں ہے، بہ یک وقت مذہبی جوش وخروش کا بہانہ اور ہندو سرداروں کا ساتھ دینا قرین عقل نہیں ہے، محمود غزنوی پر حرص اور اظہار شوکت کے الزامات قدیم مورخین نے عائد کیے ہیں اور ہندوستان پر سترہ حملوں کا سبب بھی اسی کو بتایا جاتا ہے، واضح رہے کہ محمود نے مغرب میں سومناتھ، شمال میں کشمیر اور مشرق میں کالنجر تک سترہ حملے کیے تھے لیکن مبصر کے خیال میں ان الزامات کی تحقیق کی ضرورت ہے، شاہ نامہ فردوسی کے تعلق سے بھی ایسی ہی ایک داستان اس سے منسوب کی جاتی ہے۔

بھیم دیو کے بعد گجرات کی حکومت ''کرنا'' (۱۰۶۴ء تا ۱۰۹۴ء) کو ملی، اس نے کرناوتی تالاب اور کرناوتی شہر کی بنیاد ڈالی، جس کے پاس ہی احمد شاہ نے بعد میں احمد آباد کا شہر آباد کیا، کرنا کے بعد سدھ راج تخت حکومت پر بیٹھا، اس نے سدھ پور کا شہر آباد کیا، ان راجاؤں نے بہت سے منادر اور عمارتیں بنائیں، دلوادہ میں آدی ناتھ کا مندر اور موڈھیرا میں سورج دیوتا کا مندر بھیم دیو ہی کی یادگار ہے، ۱۱۷۸ء میں اسی خاندان کے راجہ بھیم دیو ثانی کے زمانہ میں شہاب الدین محمد غوری نے نہر والہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی لیکن ۱۱۹۷ء میں اس کے جانشین قطب الدین ایبک نے بھیم دیو کو شکست دی، اس کے بعد گجرات پر مسلمانوں کے مسلسل حملے شروع ہوگئے، سولنکی خاندان کے بعد ۱۲۳۲ء سے ۱۲۹۸ء تک واگھیلا خاندان نے گجرات پر حکمرانی کی، اس خاندان نے بھی نہایت خوب صورت عمارتیں بنوائیں جن میں دلوادہ کے منادر بھی شامل ہیں، مقدمہ نگار نے ان عمارتوں کے حسن کی بے انتہا تعریف کی ہے، اس فن تعمیر میں جھالروں کے اضافہ کو یورپی مورخین اور خود مترجم مقدمہ نگار ملکوتی جھالروں سے موسوم کرتے ہیں، مترجم نے لکھا ہے ''یہی ملکوتی ساخت کی جھالریں جو اسلامی عہد میں اپنا رنگ اور روپ دکھاتی ہیں اور یہی وہ ترکہ ہے جسے گجرات کے مسلمان فرماں روانے حاصل کیا اور جس کے احسان سے وہ سبک دوش نہیں ہوسکتے''۔

۱۲۹۸ء میں کرنا واگھیلا کے عہد میں علاء الدین خلجی کا نہر والہ پر قبضہ ہوگیا اور گجرات میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی، ۱۳۰۰ء میں گجرات، سلاطین دہلی کا ایک صوبہ بن گیا جس کا دارالخلافہ نہر والہ پٹن (انہلواڑہ) تھا، ۱۳۰۶ء میں اسی علاء الدین کے زمانہ میں ملک کافور کے

ہاتھوں دیوگری (موجودہ دولت آباد واقع ضلع اورنگ آباد) فتح ہوا، اسی دولت آباد کو محمد تغلق نے اپنے عہد حکومت میں ہندوستان کا دارالخلافہ بنانے کی ناکام کوشش کی تھی، خلجیوں کا ایک قبرستان اس وقت کے مالوہ کے دارالحکومت مانڈو (واقع ضلع دھار) میں سہ دروازہ کے باہر ہے، فیروز تغلق (تخت نشینی ۱۳۴۱ء) کے عہد میں گجرات امیر ظفر خاں کی نظامت میں رہا، ظفر خاں نے مظفر کے لقب سے ۱۳۹۲ء تا ۱۴۱۰ء اس صوبہ پر حکومت کی اور پورے کاٹھیاواڑ پر قبضہ کرلیا، حاجی دبیر کی عربی تاریخ ''ظفر الوالہ بن مظفر والہ'' غالباً اسی امیر کی تاریخ پر مبنی ہے، ۱۴۰۷ء میں مظفر نے دبیر پور میں اپنی حکمرانی کا دعویٰ کیا اور مالوہ پر حملہ کرکے دھار پر قبضہ کرلیا، اس نے اپنے پوتے احمد شاہ کو اپنا جانشین مقرر کیا، یہی احمد شاہ سلسلہ سلاطین گجرات کا بانی ہے جس کا عہد حکومت ۱۴۱۱ء تا ۱۴۴۳ء ہے، اس نے مشرق میں مالوہ، شمال میں موڈاسا اور نادوت، جنوب میں چانپانیر اور سورت وغیرہ نیز مغرب میں کاٹھیاواڑ (سوراشٹر) کے سمندروں تک اپنی سلطنت کو وسعت دے لی۔

احمد شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ شہر احمد آباد کی تعمیر اور اسے عمارات عالیہ سے مزین کرنا ہے جس کی وجہ سے چھ سو سال بعد گجرات کا دارالخلافہ پٹن سے احمد آباد منتقل ہوا، اس شہر کی تزئین و تعمیر بعد کے زمانوں میں بھی جاری رہی، صاحب مرأۃ احمدی نے اسے ''زینت البلاد'' کا خطاب دیا ہے، شہر اور اطراف میں بے شمار مساجد ہیں، مرأۃ احمدی کے مصنف نے احمد آباد کی مساجد کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن پروفیسر شبیہ احمد نے جامع مسجد کے حسن اور نازک فن تعمیر پر دو پیراگراف صرف کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں ''احمد آباد کی جامع مسجد جسے احمد شاہ اول نے تعمیر کرائی تھی ۱۴۲۲ء میں بن کر مکمل ہوئی (کتاب میں کمپیوٹر کی غلطی سے ۱۲۲۴ء درج ہے) یہ ہندوستان کی بزرگ ترین مسجد میں شمار ہوتی ہے اور بہ قول فرگوسن مشرق کی حسین ترین عبادت گاہ ہے، اس میں دو بلند ستون تھے جو تناسب کے ڈھانچہ میں ڈھلے تھے اور چابک دستی کے نمونے پیش کرتے تھے لیکن ۱۸۱۹ء کے زلزلے نے ان خوب صورت میناروں کو فنا کردیا، ان میناروں کی خصوصیت یہ تھی کہ اگر ایک مینارہ کو ہلایا جائے تو دوسرا بھی لرزنے لگتا تھا''، احمد آباد کی کئی مساجد میں ایسے مینار لرزاں تھے جن میں سے سیدی بشیر کے مینار ابھی تک باقی ہیں، کچھ مینار

انگریزوں کے ذوق تحقیق کی نذر ہوئے لیکن ایک ہی وقت میں دونوں میناروں کے لرزنے کی کوئی سائنسی توجیہ دریافت نہیں ہوسکی۔

واضح رہے کہ دیگر بزرگ ترین مساجد میں درج ذیل مسجدوں کا شمار ہوتا ہے:

۲- مانڈو کے محکمہ آثار قدیمہ کے تحت ویران جامع مسجد جو فن تعمیر کا بیش قیمت شاہکار ہے، ۳- دھار کی جامع مسجد جو ہندوؤں کے دعویٰ کی وجہ سے اب صرف جمعہ کی نماز کی خاطر مسلمانوں کے لیے کھولی جاتی ہے جب کہ ہفتہ کے بقیہ اوقات میں وہاں پوجا پاٹ ہوتی ہے، ۴- بھوپال کی تاج المساجد جو فرماں روائے بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم نے تعمیر کرائی تھی لیکن جس کی تکمیل مولانا عمران خاں ندویؒ کے ہاتھوں ہوئی، ۵- دہلی کی شاہ جہانی مسجد جسے دہلی کی جامع مسجد کے نام سے جانا جاتا ہے اور ۶- حیدرآباد کی مکہ مسجد جو قطب شاہی دور میں تعمیر ہوئی تھی۔

پروفیسر شبیہ احمد صاحب نے اپنے مقدمہ کا اختتام اس شعر پر کیا ہے:

زباں ز نکتہ فرو ماند و راز من باقی ست   قضاعت سخن آخر شد و سخن باقی ست

چنانچہ انہوں نے شاہ تراب ولی کی یادداشت کا ترجمہ کرکے نہ صرف اس ''سخن'' کو پورا کیا ہے بلکہ اس یادداشت کو ''تاریخ گجرات'' کی شکل بھی دی ہے، مذکورہ شعر میں کمپیوٹر کی غلطی سے ''قضاءت سخن'' کے بجائے ''قضاعت سخن'' ٹائپ ہوگیا ہے۔

مصنف کی زبان بہت ہی مرصع و مقفیٰ تھی، مترجم نے اسی ترجیع اور ترجیز کا لحاظ رکھا ہے، مجموعی طور سے ترجمہ بہت کامیاب ہے اور احساس ہوتا ہے کہ اگر شاہ تراب علی کی زبان اردو ہوتی تو وہ یہی زبان استعمال کرتے جو پروفیسر شبیہ احمد نے استعمال کی ہے۔

پروفیسر شبیہ احمد ناچیز کے زمانۂ طالب علمی میں الہ آباد یونی ورسٹی میں شعبہ فارسی کے استاد تھے، خاکسار اپنے داخلہ کی دشواریوں میں مرحوم کے دست فیض کا بھی ممنون کرم ہے۔

کمپیوٹر کی کتابت اور آفسٹ کی طباعت سے مزین اس کتاب میں پروف کی غلطیاں بہت کم ہیں، کتاب کی قیمت صرف ستّر روپیہ آج کل کے معیار قیمت کے لحاظ سے بہت کم ہے، اہالیان علم میں اس کتاب کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

ادبیات

غزل

جناب وارث ریاضی صاحب

ہر بشر کی زندگی محصورِ غم پائی گئی
بزمِ ہستی میں خوشی کی آس ہے آئی گئی

جس طرح افلاس میں بچ کر نکل جاتے ہیں لوگ
میرے کاشانے سے یوں کترا کے پروائی گئی

کی گئی ہے مختلف انداز سے شرحِ جنوں
اک حدیثِ شوق لاکھوں بار دہرائی گئی

وہ مجسم شعر و نغمہ ، وہ سراپا رنگ و بو
اس کی محفل میں خرد کی نکتہ آرائی گئی

اللہ اللہ نوعِ انساں کی کرم فرمائیاں
وسعتِ صحرا نہیں ، دریا کی گہرائی گئی

مل گیا ہے زندگی بھر کی وفاؤں کا صلا
آنسوؤں سے ان کے ، میت میری نہلائی گئی

نا سمجھ شعر و ادب پر نقد فرمانے لگے
عظمت تنقید و روحِ فکر و دانائی گئی

کس قدر انسانیت پر وقت آیا ہے برا؟
جھوٹ کی تشہیر میں سچ کی توانائی گئی

اب کہاں دیوانوں میں لیلاؔ پہ مر مٹنے کا شوق
مہہ جبینوں سے بھی وارثؔ خوے لیلائی گئی

کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار- ۸۴۵۴۵۳ ۔

مطبوعات جدیدہ

(The Quran, Essentioal Teaching): از پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۹۲، قیمت درج نہیں،

پتہ: دی اسلامک فاؤنڈیشن، یوکے۔

قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کی آخری الہامی کتاب ہے اور بے شبہ یہ سارے انسانوں کے لیے کتاب ہدایت اور نوشتہ رحمت ہے، عربی، فارسی، اردو اور دوسری مشرقی بلکہ اسلامی زبانوں میں اس کی تفسیر اور تشریح کی کوششیں بھی کم نہیں، انگریزی زبان کی عالم گیری ظاہر ہے، اسی لیے اس زبان میں بھی کئی ترجمے، تفسیریں اور تشریحیں بھی کی گئیں، لیکن ہزاروں انگریزی داں مسلمانوں کی ضرورت کے لحاظ سے یہ بہت کم ہیں، اس کتاب کے لائق مصنف نے اس کمی کو محسوس کیا، وہ انگریزی زبان کے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں استاذ ہیں اور قرآن مجید سے ان کو خاص شغف ہے، اسی لیے برطانیہ کے اسلامک فاؤنڈیشن سے اور وہاں کے تعلیمی اداروں سے بھی ان کا تعلق ہے، قرآن مجید کے انگریزی ترجموں پر ان کی جامع اور گہری نظر ہے، زیرنظر کتاب ان کے اسی تعلق اور قرآنی علوم کی وسیع تر اشاعت کی فکر کی ترجمان ہے جس میں انہوں نے قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات، اصطلاحات، نظریات اور موضوعات کو بڑے سادہ اور آسان اسلوب میں پیش کیا ہے، کتاب کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ اس سے طالبین علوم قرآن کو قرآن کے آفاقی نقطہ نظر، اسلام، خدا اور بندہ کے تعلق، مذہبی فرائض اور اسلامی نظام اقدار کو سمجھنے اور قرآن مجید کے پیام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، یہ تعارف یا دعویٰ واقعی درست اور بجا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ، پیام الٰہی، رسول اللہؐ، کتاب اللہ، حیات و بعد حیات غیب، تخلیق، بنی نوع انسان، نماز، روزہ، صدقہ و خیرات، حج، مومن، صراط مستقیم، انسانوں سے ربط باہمی، والدین، رشتہ ازدواج، اولاد، اخلاق اور دعا جیسے موضوعات پر قرآن مجید کی روشنی میں مختصر لیکن نہایت جامع اور موثر ترجمانی آگئی ہے، جدید ذہن اور اس کی سطح اور معیار، لائق مصنف کے پیش نظر رہنے کی وجہ سے وہ اس مبارک پیش کش میں اور بھی کامیاب

ہیں، فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل جناب ایم مناظر احسن کی یہ توقع بالکل درست ہے کہ جو انگریزی داں، عربی سے ناواقف اور قرآن مجید کے معانی و مفہوم سے محروم ہیں، ان کے لیے یہ کتاب زیادہ نفع بخش اور موثر ثابت ہوگی۔

علامہ شبلی نعمانی (معنویت کی بازیافت): از ڈاکٹر شباب الدین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: شعبہ اردو، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڈھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ اور دہلی، اعظم گڈھ اور مؤ کے مکتبے۔

علامہ شبلی کی شخصیت، اسلامی تاریخ کے عہد ساز علماء کی طرح، کمالات اور جہات میں تنوع اور کثرت کی مثال تھی، ایسی شخصیتیں کم ہوئیں جنھوں نے اپنے عصر کے علاوہ آنے والی نسلوں کو اپنے علمی و تعلیمی و اصلاحی نظریات سے، غیر جانب داری سے مطالعہ کیا جائے تو کم از کم ہندوستان میں گذشتہ صدی کے ہر سنگ میل پر علامہ شبلی موجود ہیں اور موجودگی کا ثبوت ان کی معنویت کی تازگی ہے، جب یہ کہا گیا کہ اس عرصے میں علامہ شبلی کے اثرات کی عمل داری غالب ہے تو یہ دعویٰ، بے دلیل نہیں، اس کی تصدیق زیر نظر کتاب کے مقالات سے زیادہ بہتر طریقے سے ہوتی ہے، یہ مقالات شبلی کالج میں ایک نہایت باوقار سمینار میں پیش کیے گئے، موقع، علامہ شبلی کے ایک سو پچاسویں سال ولادت کا تھا، کالج کے حوصلہ مند ذمہ داروں نے اس فرصت کو یادگار بنادیا کہ سمینار میں ہندو پاک کے ممتاز عالموں اور ادیبوں کو یک جا کیا، پاکستان کے پروفیسر ریاض مجید، پروفیسر صابر کلوروی مرحوم، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر اور ڈاکٹر رابعہ سرفراز کے علاوہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر فضل امام رضوی جیسے بزرگ مشاہیر اور نئی اردو نسل کی بہترین نمائندگی نے سمینار کے موضوع یعنی شبلی کی معنویت کی بازیافت سے صحیح انصاف کیا، خاص اسی عنوان سے کئی مقالوں کے علاوہ تحقیق، تنقید، سماجی و سیاسی و تاریخی و تعلیمی شعور، عربی فارسی نگارشات، نثر و شعر حتی کہ مخطوطہ شناسی جیسے موضوعات پر فکر تازہ کی نمود ہوئی، بعض مقالات میں ایسی باتیں بھی آگئیں کہ "شبلی کا المیہ یہ تھا کہ وہ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے دینی اور مشرقی علوم کے دل سے قائل تھے لیکن ایک دانش ور کی حیثیت سے ان کے پاس کوئی

چارہ نہ تھا کہ وہ مغربی تعلیم کی حمایت کریں ...... وہ تضاد کا شکار تھے' وغیرہ، یہ خیالات نئے نہیں لیکن المیہ اور تضاد جیسے الفاظ کا استعمال عامیانہ اور سطحی یا رواروی کا مظہر ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کبھی لکھا تھا کہ "ہوش مند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیائے اسلام سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ علامہ شبلی تھے"، کہنا چاہیے کہ یہ مجموعہ مقالات اسی جملے کی تفسیر ہے اور دور حاضر کے ہوش مند حریفان اسلام کے مقابلے کے لیے شبلی جیسے شیروں اور شیر دلوں کی تلاش کے لیے صدا اور صلائے عام ہے کہ اگر حریف پنجہ فگن بھی وہی ہیں اور ستیزہ گاہ جہاں بھی وہی ہے تو فطرت اسداللّٰہی بھی فنا اور معدوم نہیں ہوئی ہے، مطالعات شبلی کے باب میں یہ مجموعہ مقالات ایک بہترین اضافہ ہے، اس کے لیے لائق مرتب تحسین و آفریں کے مستحق ہیں، سمینار کا حسن انتظام اور اب اس مجموعہ کا حسن سلیقہ دونوں ان کی صلاحیتوں کا واقعی ممنون ہے۔

عربی تنقید کا ارتقا: از پروفیسر سید احتشام احمد ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۱۲، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: پروفیسر سید احتشام احمد ندوی، مدینہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ، یوپی۔

عربی زبان و ادب جس قدر قدیم ہے اسی درجہ پر ثروت بھی ہے، اسلام سے پہلے جہاں سوق عکاظ میں عربی شاعری کا بازار گرم رہا، وہیں اسلام نے قرآن مجید کی شکل میں عربی نثر کو ایسا آفتاب روشن بخشا جس کی روشنی میں عربی نثر ارتقا کی منزلوں کی یافت میں مسلسل گام زن ہے، یہ بھی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ جو قوم اپنی شعری عظمتوں کے مقابلے میں نثر کے ابتدائی مرحلوں میں تھی، اس کے سامنے ایک ایسا نثری صحیفہ آیا جو کسی بھی نثری ادب کے بلند ترین معیار سے بھی بلند تھا، عربی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ واقعی حیرت کے ساتھ دل چسپی کا سبب ہے، زیر نظر کتاب عربی تنقید کی تاریخ ہے جس میں اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کا عمومی اور عہد عباسیہ کا خاص طور پر جائزہ لیا گیا ہے، خاص اس لیے کہ یہی وہ دور ہے جس میں عربی تنقید، معراج کمال تک پہنچی اور اس میں بڑا اثر یونانی اثرات کا رہا، مصنف کا خیال بھی یہی ہے لیکن وہ بار بار بڑی خوبی سے بتاتے ہیں کہ اسلام کی دینی، اخلاقی قدروں نے عربی تنقید پر اس طرح اثر ڈالا کہ معانی و افکار کے ساتھ اصطلاحات و اسالیب نے معیار تنقید کو کہیں سے کہیں

پہنچادیا، اس سلسلے میں انہوں نے اصمعی سے قدامہ بن جعفر تک بیسیوں متقدمین عربی ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کیا اور آخر میں یعنی باب ہفتم میں عربی تنقید کے بنیادی مباحث کا مکمل خلاصہ پیش کردیا، بحث میں تاریخی انداز نمایاں ہے، اصلاً یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو چالیس سال پہلے لکھا گیا تھا، اس عرصہ میں اردو کے معروف نقادوں کا اسلوب، اردو قارئین کے لیے قدرتاً زیادہ معروف و پسندیدہ ہوا، یہ بحث اگر اسی اسلوب میں ہوتی تو شاید زیادہ دل نشیں ہوتی، مثلاً یہ عبارت کہ ''استکراہ لفظ، تعقید معنی، وزن سے خروج، سوقی، غریب اور مبتذل کا استعمال ہے...... استعارہ بعیدہ کثرت سے ملتا ہے''، اردو والوں کے لیے یہ عبارت اور زیادہ بہتر شکل میں ہوسکتی تھی، ایک جگہ العمدہ کے حوالے سے شاعر مجآز کا ذکر ہے، یہاں مجآز کی وضاحت ضروری تھی، فاضل مصنف کے اس احساس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے ایک ایسا کام کیا جس سے اردو ادب کا خزانہ اب تک خالی تھا۔

بادۂ گل رنگ : از جناب حکیم محمد جنید عباسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: عباسی دواخانہ، قصیانہ، مڑیاہوں، جون پور، یوپی۔

شعر کی ایک خوبی یہ بتائی گئی کہ وہ از قسم حکمت ہو، زیرنظر مجموعہ کلام تو واقعی ایک حکیم شاعر کا ہے جو طلسم رنگ و بو میں گھرنے کے مذاق جستجوئے گل رخاں سے بیزاری کے اظہار کی ہمت رکھتا ہے، وہ ایسے حکیم و طبیب ہیں کہ دوا نہ ملنے پر لذت درد ہی کو عزیز جانتے ہیں، تخیل کی بلندی اور پاکیزگی ان کی شاعری کا سررشتہ اصغر و جگر سے ملاتی نظر آتی ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کا یہ جملہ سند ہے کہ ''قدرت نے حکیم صاحب کو موزوں طبیعت اور علم و ادب اور شعر و سخن کا ذوق بخشا ہے''، اس موزونی طبع کے ساتھ حکمت، تجربے اور اخلاق کی عمدہ ترجمانی اور حمد و نعت کی پاکیزگی نے اس مجموعہ کو قدر کے قابل بنادیا ہے، کہیں کہیں تخلص شاداں کا بڑا خوبصورت استعمال ہوا ہے، جیسے

غم کے مارے تو زمانے میں بہت ہیں لیکن سخت دشوار ہے اس دور میں شاداں ہونا

البتہ کتابت کی غلطیاں جابجا ہیں، ارض و سما کو سماں کے قافیے میں باندھنا محل نظر ہے، نغمات و اثرات کے ساتھ تحفات بھی نامانوس سا ہے۔ ع - ص